# نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

| جلد ۱۴ | فہرست مضامین اپریل سنہ ۱۹۴۲ء | شمار ۴ |
|---|---|---|



ملاحظات ---------- ۱

"نوسٹراڈامس" کی عجیب و غریب پیشگوئیاں ---------- ۴

ماسکو کی خونیں تاریخ ---------- ۷

مشہور شاعر، گمنام غزل گو ---------- محمد ریاض الحق ---------- ۹

پورب اور پچھم ---------- محمد عتیق صدیقی ---------- ۱۶

نقد پر نقد ---------- خان بہادر مرزا جعفر علی خاں اثر ---------- ۲۴

باب المراسلہ والمناظرہ ---------- ۳۸

مکتوبات نیاز ---------- ۴۰

وقت کی باتیں ---------- ۴۳

منظومات ... مرزا جعفر علی خاں اثر۔ فضل الدین اثر۔ پروفیسر شور۔ حسرت ترمذی۔ ماہر القادری ۔ ۴۶


# ملاحظات

## جاپان کے آیندہ اقدامات

اس میں شک نہیں لڑائی بڑی دلچسپ چیز ہے بشرطیکہ ایک غیر ذمہ دار تماشائی کی حیثیت سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ہم کو ملے، لیکن وہ اتنی ہی زیادہ دہشت انگیز بھی ہے، اگر ہماری حیثیت ایک فریق کی سی ہو جائے اور میری رائے میں جمہور کی یہی نفسیاتی کیفیت جنگ کے امتداد و شدائد کا باعث ہوا کرتی ہے

جب تک ہم کو یقین تھا کہ یہ جنگ "قہر یوروپ برجان یوروپ" سے زیادہ نہیں، باوجود تمام اُن اقتصادی دشواریوں کے، جو ہندوستان کو برطانوی علاقہ ہونے کی حیثیت سے برداشت کرنا پڑ رہی تھیں، ہم پریشان نہ تھے لیکن اب کہ یہ آگ ہمارے دروازہ تک پہونچ گئی ہے، سراسیمگی کا یہ عالم ہے، گویا جو کچھ ہونا تھا ہو چکا اور اب ہمارے لئے خاموشی سے جان دینے کے علاوہ کوئی صورت ہی باقی نہیں، حالانکہ اگر ہم نے پہلے اس لڑائی کو صرف یوروپ کی چیز سمجھ کر کوئی جذبۂ ہمدردی پیدا نہیں کیا تھا تو بھی غلطی کا تھی اور اب کہ اس کے شعلے ہمارے دامن تک پہونچ چکے ہیں، اپنے آپ کو مشیت یا قسمت کے حوالہ کر دینا دوسری غلطی ہوگی۔ موجودہ زمانہ میں، جبکہ علوم کی ترقی اور وسیع و سریع ذرائع مواصلات نے زمین کے ۲۴ ہزار میل کے محیط کو اتنا مختصر کر دیا ہے کہ ریڈیو کی لہر ایک سکنڈ میں پانچ مرتبہ کرۂ زمین کا چکر لگا لیتی ہے، مشرق و مغرب، یا شمال و جنوب کے بُعد کا کوئی سوال باقی نہیں رہا اور ساری دنیا نفع اندوزی میں نہیں، تو ضرر و نقصان کے باب میں ضرور ایک غیر منقسم وحدت کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ پھر اگر ہم اپنی نگاہ کو وسیع کر کے رنگ و نسل کے امتیاز سے قطع نظر صرف انسانیت کو سامنے نہ رکھیں، تو بھی ہم کو سمجھنا چاہئے تھا کہ بے تعلق رہنے کی حالت میں بھی ہم اس جنگ سے بے تعلق نہیں رہ سکتے تھے اور اب تو خیر، وہ ایک ایسی حقیقت میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے کہ کسی حجت و استدلال کی ضرورت ہی باقی نہیں!

پچھلے مہینے ہم نے سنگاپور کے سقوط کی خبر دیتے ہوئے، اُن امکانات سے بحث کی تھی جو ہمارے ہندوستان سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن اب کہ وہ بھی دشمن کے قبضہ میں چلا گیا

ہے اور جزیرۂ جاوا ابھی، یہ امکانات بہت کچھ تیقنات میں تبدیل ہوگئے ہیں اور جاپان کے یہ تین کامیاب اقدامات نہایت ہی ہولناک خطرہ بنتے جارہے ہیں

یہ درست ہے کہ رنگون کے شمال کی طرف جاپانی فوجوں کی پیشقدمی کی رفتار وہ نہیں ہے، جو ملایا میں پائی جاتی تھی اور یہ بھی واقعہ ہے کہ اسوقت چینی و برطانوی فوجوں کے اشتراک نے، جاپان کے سامنے کافی مشکلات حایل کردی ہیں، لیکن اگر آپ نے نقشہ دیکھنے کی زحمت گوارا کی ہے تو آپ سمجھ سکیں گے کہ برما کی سرزمین میں قابل صرف وہ علاقہ باقی رہ گیا ہے جو دریائے ارادی کے مشرق میں مانڈلے تک وسیع ہے، اور چونکہ ٹانگو اور پروم تک جاپانی فوجیں پہونچ ہی چکی ہیں، اس لئے یہ علاقہ ڈھائی سو میل سے زیادہ لمبا نہیں ہے اور اگر جاپانی قبضہ مانڈلے پر ہوگیا تو اس کے معنے یہ ہوں گے کہ برما کا پٹرول بھی برطانوی قبضہ سے گیا اور برما کی جنگ بھی تقریباً انجام کو پہونچ گئی۔ اسکے بعد بالائی برما اور مغربی حصہ کا سوال رہ جائے گا، جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کوہستانی علاقہ ہونے کی وجہ سے بہت دشوار گزار ہے اور جہاں شرقاً غرباً سارے محاذ پر برطانوی فوجیں نہایت مضبوطی کے ساتھ راستہ روکے ہوئے ہیں

ہوسکتا ہے کہ یہ موانع جاپانی کامیابیوں کو دشوار بنادیں، لیکن چونکہ خود برمی قوم کا ایک حصہ جاپان کے ساتھ ہوگیا ہے، اس لئے ایسی صورت میں جو مقامی دشواریاں برطانوی حکومت کو ہونا چاہئے، اُن کا فایدہ یقیناً جاپان کو پہونچے گا لیکن صرف برما کے انجام کو اس جنگ کا انجام سمجھنا یقیناً غلطی ہوگی، کیونکہ اب تو اندیشہ یہ ہے کہ کہیں یہ آگ ہند و سواحلِ ہند سے گزر کر اور آگے نہ بڑھے!

جاپان کے آیندہ ارادوں کے متعلق لوگوں میں اب زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا اور یہ بات روز بروز واضح ہوتی جاتی ہے کہ وہ بیک وقت نہ صرف آسٹریلیا اور ہندوستان دونوں طرف اقدام کرنا چاہتا ہے بلکہ افریقہ کے جنوب میں مڈگاسکر تک پہونچکر وہ اتنا بڑا گھیرا ڈالنا چاہتا ہے کہ نہ صرف ہندوستان بلکہ افریقہ اور ٹرکی ایسٹ بھی معہ ایران کے اس کے اندر آجائے اور اس طرح جاپانی اور نازی فوجیں کسی مقام پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاسکیں۔ اس لئے اب غور طلب امر صرف یہ ہے کہ اس کے یہ اقدامات کامیاب ہوسکتے ہیں یا نہیں؟

آپ بحر پاسفک کا نقشہ اُٹھاکر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ ٹوکیو سے لیکر سنگاپور تک اور رنگون سے لیکر آسٹریلیا تک جو رقبہ محاذ جنگ بنا ہوا ہے وہ روس و جرمنی کے محاذ سے دوچند ہے اور اگر اس میں بحر ہند و جنوبی افریقہ کے اُس حصۂ آب کو بھی شامل کرلیا جائے جہاں مڈگاسکر واقع ہے، تو اس کے معنے یہ ہیں کہ تقریباً آدھی دنیا کو محاذ بناکر جاپان جنگ کرنا چاہتا ہے اور یہ اتنا بڑا ارادہ ہے کہ اس سے قبل جاپان کیا، دُنیا کی کوئی سلطنت ایسی جرأت نہیں کرسکی

یہ درست ہے کہ جاپان کی بحری قوت زبردست ہے، یہ بھی غلط نہیں کہ اس کی طاقت اب تک محفوظ چلی آرہی تھی، تاہم یہ دعویٰ تو غالباً جاپان بھی نہیں کرسکتا کہ اس وقت تک جو کامیابیاں اسے بحرالکاہل (پاسفک) میں ہوئی ہیں، اُن میں اسے جان و مال کا کوئی نقصان ہی نہیں ہوا، اس لئے اگر وہ واقعی ٹوکیو سے لیکر مڈگاسکر تک اور برما سے لیکر آسٹریلیا و نیوگنی تک ہر جگہ مسلط ہونا چاہتا ہے اور اس کوشش میں اُسے زیادہ نہیں، صرف اتنا ہی نقصان اُٹھانا پڑتا ہے، جتنا وہ اسوقت تک اُٹھا چکا ہے تو اس کے معنے صرف یہ ہوں گے کہ وہ ایکبار شاید اپنے ارادہ میں کامیاب تو ہوجائے، لیکن اس کامیابی کی عمر بہت کریز پا ثابت ہوگی —— یہ اس صورت میں ہے جبکہ ہم برطانیہ اور امریکہ دونوں کو بالکل عضو معطل سمجھ کر یہ فرض کرلیں کہ آیندہ بھی اسے ایسی ہی آسان کامیابیاں حاصل ہوتی رہیں گی جیسی اسوقت تک اس کو حاصل ہوئی ہیں۔ لیکن اگر یہ صحیح ہے کہ امریکہ و برطانیہ اپنی جارحانہ طیاریاں مکمل کرچکے ہیں اور شاید مستقبل قریب میں ان کی پوزیشن بجائے مدافعت کرنے کے حملہ کرنے کی ہوجائے گی، تو پھر جاپان کے اتنے بڑے ارادہ کا حشر واضح ہے

جس طرح دنیا کی ہر آگ کے لئے ایندھن کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح لڑائی کی آگ کو بھی ایندھن درکار ہوتا ہے اور اس ایندھن میں آجکل صرف انسان ہی شامل نہیں ہیں بلکہ پٹرول، لوہا، کوئلہ، سونا، چاندی اور اسی طرح کی بہت سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جاپان کو نہ صرف اس ایندھن بلکہ اسکے حمل و نقل کا بھی انتظام کرنا ہوگا اور ظاہر ہے کہ ایک طرف دُھراتر میں ہندوستان کی طرف اور دوسری طرف دُھر دکھن میں آسٹریلیا کی جانب ہر وقت ضرورت کے مطابق، فوج اور سامان بھیجتے رہنا کوئی معمولی بات نہیں

حقیقت سے انکار ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کرسکتا، لیکن یہ بات ضرور حقیقت سے قریب ہے کہ اتنے بڑے ملک کو سر کرنا ہفتخواں طے کرنے سے کم نہیں، اور اگر ایکبار یہاں اس کی پگڑی اُلجھ گئی تو شاید چین سے زیادہ تلخ تجربات سے اسے دوچار ہونا پڑے

یہ درست ہے کہ فوجی آراستگی کے لحاظ سے آسٹریلیا کی حالت ہندوستان سے بہتر ہے، اور چونکہ اسے امریکہ اور انگلستان سے بھی مدد پہونچ سکتی ہے، اسلئے

اسکی قسمت کا فیصلہ شاید اتنی جلد نہ ہوگا جس قدر جلد جاوا کا ہوا، لیکن ہندوستان باوجود اس کے کہ وہ نہتا ہے، باوصف اس کے کہ یہاں کی رعایا کو سوائے اینٹ پتھر چلانے کے اپنی حفاظت کا کوئی اور طریقہ معلوم نہیں، اس کا قومی مزاج بالکل بدل چکا ہے اور وہ جاپان کیا کسی اجنبی قوم کی حکومت قبول نہیں کر سکتا، یعنی اگر ہندوستان جاپانی تسلط کے خلاف تیغ و تفنگ سے کام نہیں لے سکتا، تو وہ اپنی روحانی بغاوت سے کام لیکر اسے یہاں چین سے بیٹھنے بھی نہیں دے گا اور یہ اتنا بڑا سیاسی دباؤ ہوگا جس کے بوجھ کو وہ کیا کوئی بھی عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتا

جاپان سمجھتا ہے کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرنے میں اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ تمام برطانوی ذرایع کے سرچشموں کو خشک کر دے اور شاید اسی لئے وہ سنگاپور سے مڈگاسکر تک ایک آتشیں خط برطانیہ کی راہ میں حایل کر دینا چاہتا ہے تاکہ بحر روم اور مشرق وسطی کی طرف سے کوئی مدد ہندوستان کو نہ پہونچ سکے لیکن اس میں اسی وقت کامیابی ہو سکتی ہے جب مڈل ایسٹ اور ہندوستان کے خشکی کے راستوں کو بھی بند کر دیا جائے اور شاید اسی لئے بعض اہل الرائے کا خیال ہے کہ ممکن ہے اب جرمنی مڈل ایسٹ کی طرف بڑھے کیونکہ جاپان کو جرمنی کی طرف سے مدد پہونچنے کی صرف یہی ایک صورت ہے

بہرحال جاپان، ہندوستان پر فوری حملہ کرے یا نہ کرے، لیکن ہندوستان خطرہ کی زد میں ضرور آگیا ہے، اور اگر اس دوران میں امریکہ اور برطانیہ کی طرف سے پاسفک میں جارحانہ حملے شروع نہ ہوگئے، تو اس خطرہ کا واقعہ کی صورت اختیار کر لینا یقینی سمجھئے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر جاپان نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اسکی صورت کیا ہوگی۔ بظاہر اس کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ برما کی طرف سے براہ خشکی حملہ کرے، دوسری یہ کہ سواحل ہند پر وہ پانی کے راستے سے اپنی فوجیں اتارے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ بیک وقت دونوں صورتیں اختیار کرے گا۔ ہر چند بحر ہند میں برطانوی قوت سنگاپور کے نکل جانے سے کافی کمزور ہوگئی ہے، لیکن اگر جاپان نے میلون یا مدراس یا خلیج بنگال کی طرف سے حملہ کیا جس کا رنگون اور جاوا پر قبضہ ہو جانے کی وجہ سے قوی امکان ہے، تو برطانیہ کی ہوائی طاقت جاپانی جہازوں کی نقل و حرکت میں کافی موانع پیدا کرے گی اور یہ کام اتنا آسان نہ ہوگا جتنا خیال کیا جاتا ہے، رہا خشکی کا معاملہ، سو وہاں جاپان کو اور زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا، کیونکہ ہندوستان ایسے وسیع ملک کے لئے جتنی فوج اور جتنے سامان کی ضرورت ہے وہ یقیناً آسانی سے فراہم نہیں ہو سکتا

نیوگنی اور آسٹریلیا پر جاپان نے حملہ شروع کر دیا ہے، لیکن یہاں امریکی کمک کافی مقدار میں پہونچنے لگی ہے اور اسوقت تک کہ پاسفک کا موسم خود جاپانی مقبوضات پر بمباری کی اجازت نہ دے، یہ لڑائی بھی ٹھہر جائے گی اور ممکن ہے کہ موسم کی تبدیلی کے بعد جاپان کو اپنے جارحانہ پوزیشن میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا پڑے!

## روس کا محاذ

جوں جوں سردی ختم ہوتی جارہی ہے، روس کے محاذ میں بھی تغیر پیدا ہوتا جارہا ہے اور غالباً وسط اپریل تک، روس کو اپنے موجودہ نقشۂ جنگ میں تبدیلی کرنا پڑے۔ سردیوں میں روسی فوجوں نے نازی افواج کو پیچھے ڈھکیلنے کی بڑی کوشش کی، لیکن بحر ازوف سے لیکر لینن گراڈ تک کوئی ایک اہم مقام بھی جرمنوں سے خالی نہیں کرایا جا سکا، کرچ، رستوف، خارکوف اور اسمولنسک کا خط بدستور جرمن قبضہ میں ہے اور سوائے اس کے کہ کالینن اور تخوین خالی کرا کے لینن گراڈ اور ماسکو کے درمیانی سلسلۂ مواصلت پھر قایم کر لیا گیا ہے اور موجا سک و کالوگا سے جرمن فوجوں کو ہٹا کر ماسکو کے محاصرہ کو کمزور کر دیا گیا ہے، کوئی قابل ذکر تغیر اس محاذ میں نہیں ہوا۔ آپ نقشہ اٹھا کر دونوں فریق کے فوجی پوزیشن کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ سوائے چند میل کی ایک پٹی کے جو شمال سے جنوب تک چلی گئی ہے، اور باقی تمام حصہ مغربی روس کا بدستور جرمن قبضہ میں ہے اور یقیناً روس کو ان سردیوں میں وہ کامیابی نہیں ہوئی جس کی اُسے اور ساری دنیا کو توقع تھی، لیکن اس سے ایک فایدہ ضرور ہوا اور وہ یہ کہ نازیوں کو اب موسم بہار میں دوسرا حملہ کرنے کے لئے بہت زیادہ قوت صرف کرنا پڑے گی اور وہ فوج جو مخصوص اس حملہ کے لئے محفوظ تھی ناکافی ثابت ہوگی، لیکن یہ حملہ یقینی ہے اور ہو سکتا ہے کہ اس مرتبہ اس کا مرکز ثقل قاف کی طرف ہو اور ماسکو و لینن گراڈ کے محاصرہ کارروائیاں صرف اس لئے جاری رکھی جائیں کہ روس، قاف کی طرف اپنی پوری قوت صرف نہ کر سکے — اگر واقعی لڑائی نے یہ رُخ اختیار کیا اور قاف سے گزرنے میں نازیوں کو غیر معمولی دشواریاں پیش آئیں، جن کا قوی امکان ہے، تو ترکی کا سوال پھر ایکبار سامنے آجائے گا، اور ہو سکتا ہے کہ ترکی کی غیر جانبداری کو صدمہ پہونچے۔

مڈل ایسٹ میں اسوقت برطانوی فوجوں کا خط دفاع طبروق، سولم، اسکندریہ اور نہر سویز سے شروع ہو کر فلسطین، شام و موصل ہوتا ہوا ایران تک چلا گیا ہے، اس لئے اگر جرمنی نے ترکی کی طرف سے بڑھنے کا ارادہ کیا تو اسے برطانیہ کی بڑی زبردست محفوظ فوج سے مقابلہ کرنا پڑے گا اور عراق و باکو کے پٹرول تک پہونچنا کوئی آسان کام نہ ہوگا — بہرحال اندیشہ قوی ہے کہ اپریل سے لڑائی کی آگ پھر زیادہ شدید صورت اختیار کرے گی اور ہو سکتا ہے کہ ایشیا اور یورپ سے دو علیحدہ علیحدہ اٹھنے والے شعلے ایک دوسرے کو چھو کر، سارے کرۂ ارض کو اپنی آتشیں چادر میں لپیٹ لیں —

# "نوسٹراڈامس" کی عجیب و غریب پیشگوئیاں

نوسٹراڈامس، ایک یہودی نسل کا نجومی تھا جو فرانس کے ایک مقام پراونس میں پیدا ہوا تھا (۱۵۰۳ء)، اس کا اصل نام "میکائل ڈی نانسٹری ڈیم" تھا۔ علم و فضل کے لحاظ سے بڑے مرتبہ کا انسان تھا۔ پہلے عرصہ تک طبابت کرتا رہا، اور ۴۴ سال کی عمر کے بعد اس نے الہامی قسم کی پیش گوئیاں شروع کیں جن کا مجموعہ "Centuries" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مجموعہ سب سے پہلے ۱۵۵۵ء میں شایع ہوا، اس میں سات آنے والی صدیوں کے متعلق رباعیوں کی شکل میں پیشگوئیاں درج تھیں۔ اس کے بعد ۱۵۵۸ء میں اس کا دوسرا ڈیشن شایع ہوا جس میں دس صدیوں کا حال پایا جاتا تھا۔

اس کی پیشگوئیوں کے متعلق مختلف رائیں پائی جاتی ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ ان کا استخراج علم نجوم کے ذریعہ سے کیا گیا تھا اور بعض انھیں صرف مجذوب کی بڑ سمجھتے ہیں، لیکن چونکہ اب بہت سی باتیں پوری ہو رہی ہیں اس لئے دُنیا کو پھر اس طرف توجہ ہوئی ہے اور وہ لوگ جو موجودہ جنگ کا نتیجہ معلوم کرنے کے لئے بیتاب ہیں، ان پیشگوئیوں میں بعض باتیں بہت تعجب انگیز پائیں گے۔ اس نجومی کا انتقال ۱۵۶۶ء میں ہوا تھا اور ۱۷۸۱ء میں اس کی یہ کتاب کلیسا کی طرف سے ممنوع الاشاعت قرار دی گئی تھی۔

جان کالبرنے اپنے ایک مقالہ میں اس نجومی کی ان پیش گوئیوں کا حال فسانوی انداز میں بیان کیا ہے، جس کا اقتباس حاضر ہے۔

---

ایک سفید ریش و بردوت والا انسان، شاہ بلوط کی بوسیدہ میز پر بیٹھا ہوا ہے، بہت سے قدیم کرم خوردہ مخطوطات سامنے بکھرے ہوئے پڑے ہوئے ہیں اور ایک موم شمع کی زرد روشنی کمرہ کی پرانی بدرنگ سنگی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر میز پر پڑ رہی ہے۔

اس کا ایک ہاتھ جو جھریوں کے سوا کچھ نہیں، ٹھوڑی کے نیچے ہے اور اس کی سیاہ عقاب کی سی آنکھیں مخطوطات کے نقوش کو دیکھ رہی ہیں۔ یہ نقوش بہت عجیب و غریب تھے اور اتنے پیچیدہ کہ معمولی ریاضی داں ان کو نہ سمجھ سکتا تھا۔ ان نقوش کا تعلق دنیا کی آیندہ تاریخ سے تھا اور جن کو صرف یہی سمجھ سکتا تھا۔

دفعتاً یہ نجومی اُٹھا۔ مخطوطات کو سمیٹا اور اپنے کاندھے پر چادر ڈالکر، شہر لائمنس کی ایک تنگ و ناہموار گلی میں نکل گیا۔ یہ بات سولھویں صدی کی ہے۔ لوگوں نے اُسے دیکھا تو آپس میں سرگوشی کرنے لگے کہ "ڈاکٹر نوسٹراڈامس یہی ہے، لیکن اسوقت یہ اپنی کوٹھری سے کہاں نکل پڑا۔ یہ تو کہیں باہر نہ نکلتا تھا"

یہ تھوڑی دور چلکر بن ہوم کے چھاپہ خانہ میں داخل ہو گیا۔

---

"ڈاکٹر، تمھاری اس کتاب کو میں ضرور چھاپوں گا، کیونکہ اس میں بڑی عجیب و غریب باتیں درج ہیں اور لوگ ایسی باتیں سننے کے بڑے شایق ہوتے ہیں" بن ہوم نے کہا

ڈاکٹر :- "لیکن کیا تمھیں میری پیش گوئیوں کا یقین نہیں ہے"

بن ہوم :- "بالکل نہیں"

ڈاکٹر :- "خیر کوئی حرج نہیں، آج نہ سہی، کل تو یقین کروگے"

اور ہوا بھی یہی کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا نہ صرف بن ہوم بلکہ اور بہت سے منکرین کو ان پیش گوئیوں پر یقین لانا پڑا۔

---

اس وقت تک کوئی عقلی توجیہ اس کی نہیں ہو سکی کہ ڈاکٹر کی بتائی ہوئی باتیں کیوں صحیح نکلیں، لیکن چونکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس کا بتایا ہوا مستقبل، حال کی واقعیت میں تبدیل ہونے لگا، اس لئے دُنیا کو حیرت کے ساتھ سب کچھ باور کرنا ہی پڑا اور آیندہ بھی شاید یہ سلسلہ جاری رہے گا، کیونکہ اس نے ساڑھے پانسو سال

کے رونما ہونے والے واقعات بتائے ہیں اور ان میں سے ابھی بہت سے ظاہر نہیں ہوئے، خاص کر یہ پیش گوئی کہ ۱۹۹۸ء میں ساری دُنیا ایک زبردست طبقاتی انقلاب سے دوچار ہوگی اور اس کا نتیجہ عام تباہی و بربادی ہوگی۔

---

خود ڈاکٹر کی زندگی کی ابتدائی داستان بہت دردناک ہے۔ تمام یورپ میں طاعون پھیلا ہوا ہے اور جنوبی فرانس کا علاقہ بھی اس مصیبت میں مبتلا ہے۔ ہر ہر گھر سے لاش پر لاش نکل رہی ہے اور بستیوں کی بستیاں ویران ہوتی جارہی ہیں۔

معالجین کی جماعت چمڑے کے کپڑے پہنے ہوئے، منہ میں ہلدی کی گرہ دبائے، نتھنوں میں روئی ٹھونسے ہوئے، آنکھوں پر گھنٹا ٹوپ چشمے چڑھائے۔ مرض کے دفع و علاج میں مصروف نظر آتے ہیں لیکن بیدلی، بے پروائی اور بے اُصولی کے ساتھ۔ البتہ ان میں ایک نوجوان ڈاکٹر، میکائیل نوسٹراڈامس ایسا ہے جو بالکل اُصول کے ساتھ اس وبا کا مقابلہ کر رہا ہے، مگر دوسرے ڈاکٹر اس کی توہین و تضحیک کرتے ہیں اور وہ گھبرا کر باہر قصبات و دیہات کی طرف چلا جاتا ہے اور علاج میں بہت کامیاب ہوتا ہے۔

اس کی ہمدردیوں کا نتیجہ ہوتا ہے کہ گاؤں کے رہنے والے اسے ولی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح ۲۶ سال کی عمر میں وہ قومی ہیرو بن جاتا ہے، اسی زمانہ میں گاؤں کی ایک خوبصورت لڑکی سے اس نے شادی کرلی اور اس سے دو اولادیں بھی ہوئیں، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ جب دوبارہ طاعون پھیلا تو اس نے ساری دُنیا کو نجات دلائی لیکن خود اپنی بیوی اور بچوں کو نہ بچا سکا۔ اس واقعہ کا اس کی زندگی پر بہت گہرا اثر ہوا اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آوارہ گرد درویش بنگیا اس آوارہ گردی کے سلسلہ میں اس نے سارا یورپ چھان مارا اور جہاں گیا علم کی تلاش جاری رکھی، یہاں تک کہ بہت سے حجابات اس کی نگاہوں سے اُٹھ گئے اور کاہنوں کی سی کیفیت اس پر طاری ہوگئی، جو ابتدا تھی اس کی ملہمانہ پیش گوئیوں کی!

اس کی پیش گوئیاں ثمنوی کی صورت میں ہیں، جن سے بعض بہت مبہم اور بعض بہت صاف ہیں۔ اس شخص میں کیوں یہ صلاحیت پیدا ہوئی اس کے متعلق مختلف رائیں ہیں۔ خود اس کا بیان یہ ہے کہ اس کے دادا سے بعض قدیم مصری کتبے اس کو ملے تھے اور انھیں کی مدد سے وہ پیش گوئیاں کرتا ہے، کبھی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اس کی ولادت ایسے سیاروں کے زیر اثر ہوئی ہے کہ اس میں قدرت کی طرف سے اس کی اہلیت پیدا ہوگئی ہے۔

بعض ناقدین کا خیال ہے کہ جب قدیم زمانہ میں عبرانی مصر سے بھاگے ہیں تو وہ وہاں کی خانقاہوں سے بعض ایسے مخطوطات بھی لائے تھے جن کا تعلق علم نجوم سے تھا، یہی مخطوطات نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آئے اور بعد کو نوسٹراڈامس تک پہونچے، بہرحال حقیقت جو کچھ کہ رہی ہو، اس میں کلام نہیں کہ اسکی چند پیش گوئیاں بڑی حد تک صحیح ثابت ہوئیں۔

## بعض پیش گوئیاں

ایک رباعی میں اس نے فرانس کے بادشاہ ہنری ثانی کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ تو ایک شخص سے لڑے گا اور اندھا ہوکر نہایت دردناک موت مرے گا۔ ہنری اول اول بہت برہم ہوا، لیکن اُسے ایک اور کاہن کا کہنا یاد آگیا جو قریب قریب اسی کے تھا، اور اس نے اپنی بیوی کیتھرائن سے کہا کہ میں اس شخص سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیتھرائن چونکہ خود اس قسم کی باتوں پر زیادہ اعتماد کرتی تھی اور اپنے تین لڑکوں کے مستقبل کی طرف سے فکرمند تھی، اس لئے اس نے اس کو طلب کیا۔ اس نے بادشاہ کے متعلق تو وہی کہا جو پہلے کہا تھا، اور لڑکوں کے متعلق کہا کہ تینوں تخت نشین ہوں گے چنانچہ تاریخ نے اس پیش گوئی کو حرف بہ حرف صحیح ثابت کردیا۔

انگلستان کے متعلق اس نے کہا کہ تین صدی تک یہ سلطنت بہت کامیاب رہے گی لیکن اس کے بعد لندن کی (Semate) اپنے بادشاہ کو قتل کردے گی۔ چنانچہ چارلس اول کا واقعۂ قتل بہت مشہور ہے۔

اس نے انقلاب فرانس، اور نپولین کے عروج کی بھی پیش گوئی کی تھی اور اس قدر تفصیل کے ساتھ گویا وہ انقلاب فرانس کی تاریخ لکھ رہا ہے۔

اس نے پچھلی جنگ عظیم کی بھی پیش گوئی کی ہے اور لکھا کہ اس کے بعد دُنیا دو جماعتوں میں تقسیم ہوجائے گی۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ جرمنی کی جمہوریت کو ایک جرمن ڈکٹیٹر (جو جرمنی کا باشندہ نہ ہوگا) ختم کردے گا، چنانچہ ہٹلر واقعی جرمنی باشندہ نہیں ہے اور اس نے وہاں کی جمہوریت کو ختم کردیا۔

اس نے نازی بربریت اور عیسویت کے تصادم، موجودہ عہد کے اضطرابات، روم برلن فتوحات، یہودیوں کی مصیبتوں، اسلحہ کی غیر معمولی صنعت اور

نازم و کمیونزم کے خلاف مذہب والوں کی ناپسندیدگی اور اقوام عالم کا باہمد گر اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ کمیونزم کی ترقی اسپین و فرانس تک پہونچ جائے گی، لیکن اس تحریک کا سردار (جس سے مراد غالباً اسٹالین ہے) ایشیا و یوروپ بھر کو کمیونسٹ بنانے کے ارادہ کو ترک کر دے گا۔ اس نے اسپین کی خانہ جنگی کا بھی ذکر کیا ہے (جو حال ہی میں ہوئی تھی)

اس نے یہ بھی ظاہر کیا ہے کہ ۳۸ء کے لگ بھگ دنیا جنگ کے خوف میں مبتلا ہو جائے گی، لیکن اصلی لڑائی ۱۹۴۰ء میں شروع ہوگی (چنانچہ ہوئی) ۳۳ء کے متعلق اس نے لکھا کہ "جرمنی میں مختلف طبقے پیدا ہوں گے اور ایک نیا فلسفی طبقہ دیسا رونما ہوگا جو موت، اور عزت سب کو ٹھکرا دے گا۔ اس جماعت کا اثر صرف جرمنی کے پہاڑوں تک محدود نہ رہے گا بلکہ پریس اور پبلک بھی اس کی حمایت کریں گے۔

ان پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس نے یہ بھی کہا کہ بڑے ہلاکت بار پرندیا ہوائی عفریت بھی پیدا ہوں گے جو آسمانوں سے اُتر کر انسانی آباد کو خانہ برباد کر دیں گے جس سے مراد غالباً ہوائی جہاز ہیں)

اس نے بتایا ہے کہ مصیبت کا یہ زمانہ ۴۰ء سے شروع ہوگا اور ۴۴ء تک قائم رہے گا، اس جنگ میں جرمنی، فرانس پر حملہ کرے گا اور اسپین، جرمنی کو اجازت دیدے گا کہ وہ کوہستان پائرینز کو اپنا فوجی مرکز قرار دے۔ لیکن انگلستان فرانس کی مدد کرے گا۔ مشرق میں ۴۰ء اور ۴۴ء کے درمیان نہایت سخت زلزلے آئیں گے اور انسانی آبادی بہت تباہ ہوگی۔

اس زمانہ میں، فرانس بغاوت سے دوچار ہوگا اور بالجیم دو جماعتوں میں منقسم ہو جائے گا۔ ۴۱ء اور ۴۴ء کے درمیان بحر روم میں ایک زبردست جنگ ہوگی جو اٹلی کے بیڑے کو بالکل تباہ کر دے گی۔ یہ حالات یا تو یوروپ کو ختم کر دیں گے یا سخت انقلابات پیدا کرنے کا باعث ہوں گے، جو جرمنی اور اٹلی کو بھی گھیر لیں گے۔

۴۴ء کے لگ بھگ، ایک سخت قتل عام کے بعد فرانس کی تیسری جمہوریت ختم ہو جائے گی اور دھوکا دیکر پیرس پر قبضہ کر لیا جائے گا، لیکن اس کے بعد تین فوجیں پیرس پر حملہ کریں گی اور وہ شخص جس نے دھوکا دیا تھا معہ اپنے رفیقوں کے پھانسی پر چڑھا دیا جائے گا اس کے بعد فرانس کو مختصر سا زمانہ امن و ترقی کا ملجائے گا۔

اس عہد کے متعلق اس نے ایک عجیب و غریب پیش گوئی یہ کی ہے کہ ایک نیا بادشاہ ہنری پنجم جس کی ولادت ۱۸۹۲ء میں ہوگی، فرانس کے تخت پر بیٹھے گا جو اسپین پر بھی حکومت کرے گا۔ یہ بادشاہ ہنری چہارم کی اولاد میں سے ہوگا لیکن ناجائز اولاد!

اول اول پانچ سال تک اس کا پایۂ تخت (Avignon.) رہے گا، کیونکہ پیرس تباہ ہو چکا ہوگا، اس کے بعد ۴۵ء میں اس کی سلطنت اٹلی تک وسیع ہو جائے گی اور تین قوموں پر اس کی حکومت ہوگی، یہاں تک کہ وہ جرمنی کی بغاوت کو بھی دبائے گا اور رہائن تک فرانس کے حدود وسیع ہو جائیں گے۔

اس نے اسی زمانہ روس و جاپان کی جنگ کی بھی پیش گوئی کی ہے۔

یہ پیش گوئیاں ۳۸ء سے لیکر ۴۷ء تک کے زمانہ کے لئے ہیں اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بہت کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد اس نے مستقبل بعید کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۹۹۹ء میں ایک بڑا زبردست بادشاہ آسمان کی طرف سے اُترے گا، اس کی زبان بہت عجیب و غریب ہوگی جو لاطینی یا یونانی شاخ کی زبانوں میں کسی زبان سے نہ ملتی ہوگی۔ اس کے پاس بڑے مہلک اسلحہ ہوں گے اور ہرن اس کے ساتھ ہوں گے۔ چونکہ ہرن شمال سائبیریا کی قوموں کا نشان ہے اس لئے اس پیش گوئی سے مراد غالباً یہی ہے کہ شمال سائبیریا کی قومیں سارے یوروپ پر چھا جائیں گی۔ اس نے آگے چلکر کہا ہے کہ قومیں فرانس پر حملہ کر کے اسے بالکل تباہ کر دیں گی اور "ایک شعلہ ایسا بھڑکے گا کہ وہ خود بھی اسے نہ بجھا سکیں گی اور فرانس کی راجدھانی جلکر بالکل خاک ہو جائے گی اور ایک آدمی بھی اس کا زندہ نہ بچے گا"

۶۰۰۰ء کے متعلق اس نے عجیب و غریب پیش گوئی کی ہے اور وہ یہ کہ یہ سال یوروپ کی عام تباہی کا سال ہوگا، صحرائے گوبی پھر سمندر میں تبدیل ہو جائیگا اور دنیا کا نقشہ بالکل بدل جائے گا۔

ان پیش گوئیوں کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے انجام کو بھی دیکھ لیا تھا، چنانچہ یکم جولائی ۱۵۶۶ء کی شام کو جب اس کا نوکر آئندہ صبح کے لئے دعائے عافیت دیکر رخصت ہونے لگا تو نوسٹراڈامس نے کہا کہ "صبح تک میں کہاں رہوں گا" اور واقعی وہ ۲ جولائی ۱۵۶۶ء کی صبح کو اپنے بستر پر موت کی ابدی نیند سو رہا تھا۔

# ماسکو کی خونیں تاریخ

ایک خستہ حال، خاک بسر مخبر، ہانپتا کانپتا فرمانروائے ماسکو کے پاس آتا ہے اور کہتا ہے کہ "دشمن دریائے وولگا کو عبور کر چکا ہے اور لوٹ مار کرتا، بستیوں میں آگ لگاتا اور آدمیوں کو ذبح کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے۔ اب وہ عنقریب اس شہر میں پہونچنے والا ہے اور مفر کی کوئی صورت ہمارے سامنے نہیں کیونکہ دشمن تعداد میں ہم سے کہیں زیادہ ہے"۔

جو کچھ اس مخبر نے کہا وہ حرف بہ حرف صحیح نکلا، کیونکہ دشمن اپنی خونیں یلغار کے ساتھ آگے بڑھتا رہا اور ماسکو پہونچ کر تمام عمارتیں زمین کے برابر کر کے رکھدیں۔ بادشاہ و امراء، گرجا میں پناہ گزیں ہو چکے تھے، لیکن فاتح نے یہاں بھی ان کو نہ چھوڑا اور حکم دیا کہ گرجا میں آگ لگا دی جائے۔

یہ واقعہ اب سے سات صدی پہلے (۱۲۳۷ء) کا ہے، جب چنگیز خاں کے ایک پوتے باتی نے ماسکو پر حملہ کیا تھا اور ماسکو کی تاریخ میں سب سے پہلے اسی حملہ کا پتہ چلتا ہے، اس حملہ سے ایک صدی قبل ماسکو کی بنیاد ایک شہزادہ نے ڈالی تھی جو ہنری لڈ ثانی، شاہ انگلستان کا داماد تھا اور خدا معلوم کس ساعت میں یہ بنیاد پڑی تھی کہ ہمیشہ آگ و تلوار سے اس شہر کو برباد کیا گیا اور ہمیشہ یہاں کی خاک سے پھر دوسرا ماسکو پیدا ہو گیا۔

روس کا مشہور قومی شاعر پشکن لکھتا ہے کہ "ماسکو کا لفظ روسیوں کے دل پر جو اثر کرتا ہے، اس کا اندازہ کوئی کر ہی نہیں سکتا۔ اس لفظ میں بیشمار ایسی روایات چھپی ہوئی ہیں جو ایک ایک روسی کے دل میں منقوش ہیں"۔ اور اس میں شک نہیں کہ روسی اس شہر سے حد درجہ محبت کرتے ہیں۔ یہ شہر ان کے لئے خاص مذہبی عظمت رکھتا ہے کیونکہ قدیم ایام میں جب روس کی قومی زندگی میں مذہب کا بہت اثر پایا جاتا تھا، ماسکو ہی ایک ایسا مقام تھا جو صحیح عیسویت کا مرکز تھا۔ ہر چند سنٹ پیٹرز اور سنٹ پال کے مشہور گرجا، روما میں پائے جاتے تھے، لیکن وہ دشمنوں کے ہاتھوں تباہ ہو چکے تھے۔ روما کی تباہی کے بعد جب ترکوں نے سلطنت بازنطین کو بھی ختم کیا تو اس وقت صرف روس ہی ایک ایسا ملک رہ گیا تھا جسے صحیح معنے میں عیسوی حکومت کہہ سکتے تھے اور جس کے پایۂ تخت ماسکو کا گرجا تمام یوروپ کے کلیساؤں میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔

دوسرے ملک کے لوگ جب ماسکو جاتے ہیں تو وہ ماسکو کی تعمیر اور وہاں کی فضا کو دیکھ کر حیران ہوتے ہیں کیونکہ اسے نہ مغربی شہر کہہ سکتے ہیں نہ مشرقی۔ بلکہ وہ دونوں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ سنٹ باسل کی تعمیر کی وحشیانہ عظمت، کریملن کے جدید کلیسا، مضافات میں لکڑی کے مکانات اور وہاں کی گلیاں یہ سب ملکر مغرب و مشرق دونوں کا ملا جلا منظر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہے۔

اول اول جب ماسکو تباہ کیا گیا تو وہاں کے باشندوں نے چند سال کے اندر اسے زیادہ وسیع پیمانہ پر پھر از سر نو تعمیر کر لیا، لیکن نصف صدی سے کچھ ہی زیادہ گزرا تھا کہ ۱۲۹۲ء میں پھر تاتاریوں نے حملہ کیا اور تمام گرجا اور عمارتیں جلا کر اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اس کے بعد جب تاتاری ماسکو کو ویران و برباد کر کے چلے گئے تو بقیہ السیئہ آبادی نے جلتے ہوئے مکانوں کی آگ بجھائی، خاک کے ڈھیر صاف کئے اور گیارہ سال کی مسلسل محنت کے بعد پھر از سر نو اسے آباد کیا اور نصف صدی تک یہ شہر ترقی کرتا رہا یہاں تک کہ تاتاریوں سے زیادہ ظالم ایک اور دشمن نے اس پر پھر حملہ کیا اور یہ دشمن طاعون تھا۔ اس نے آدھی سے زیادہ آبادی صاف کر دی۔ اس مصیبت سے نجات پانے کے بعد اہل ماسکو نے پھر اپنے شہر کو سنوارا، لیکن ۱۳۸۰ء میں تاتاریوں نے پھر اس کا محاصرہ کیا۔ اس مرتبہ اہل ماسکو نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہو وہ دشمن کو اندر نہ آنے دیں گے، چنانچہ حملہ آور جب بڑھتے تھے تو برجوں سے کھولتا ہوا پانی اور لکڑیوں کے بڑے بڑے گندے اُن پر پھینکے جاتے تھے اور برابر تین دن تک سخت مقابلہ جاری رہا۔ تاتاریوں کو اس محاصرہ میں اتنا نقصان ہوا کہ انھوں نے مکر و فریب سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور شہر والوں کو پیام بھیجا کہ اہل ماسکو سے ان کو کوئی عناد نہیں ہے بلکہ لڑائی صرف فرمانروا اور اس کے ساتھیوں سے ہے اس لئے اگر باشندگان ماسکو

شہر پناہ سے باہر نکل کر جانا چاہتے ہیں تو شوق سے چلے جائیں، اُن سے کوئی تعرض نہ کیا جائے گا۔

ان لوگوں نے دشمن کی اس بات کا یقین کر لیا اور پادری کی قیادت میں تحایف وغیرہ لیکر دشمن کے پاس چلے، لیکن تاتاریوں نے بدعہدی کر کے ان پر بھی حملہ کر دیا اور پھر قلعۂ کریملن میں داخل ہو کر قتل عام شروع کر دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ایک دن میں ۲۴ ہزار آدمی انھوں نے قتل کیے، اس کے بعد شہر کو لوٹنا شروع کیا اور لوٹ مار کر کے واپس چلے گئے۔

اس حملہ میں صرف چند مکان باقی رہ گئے جو پتھر کے بنے ہوئے تھے ورنہ سب کے سب جلکر خاک سیاہ ہو گئے، لیکن اہلِ ماسکو نے پھر ہمت سے کام لیا اور ۱۳۸۹ء تک ایک اور نیا ماسکو جو بہت زیادہ وسیع و شاندار تھا طیار کر لیا۔

یہ وہ تباہیاں تھیں جو بیرونی حملہ آوروں کی طرف سے ماسکو پر نازل ہوئیں، لیکن خود وہاں کے فرمانرواؤں نے جو بربادیاں پھیلائیں، وہ بھی کم نہ تھیں۔ اس سلسلہ میں یہاں کے فرمانروا ایسلی سوم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

شادی کے ۲۰ سال بعد تک جب کوئی اولاد اس کی نہ ہوئی، تو اس نے اپنی بیوی کو مجبور کیا کہ وہ گرجا میں جا کر گوشہ نشین ہو جائے تاکہ اُسے دوسری شادی کرنے کا موقعہ مل جائے۔ اسی کے ساتھ بادشاہ نے یروشلم کے بڑے پادری کو اطلاع دی کہ کیا اُس کا یہ فیصلہ صحیح ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پادری نے فوراً جواب دیا کہ اگر بادشاہ نے دوسری شادی کی تو اس سے جو اولاد پیدا ہوگی وہ تاتاریوں سے زیادہ ظالم ثابت ہوگی اور رعایا کا اتنا خون بہے گا کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کر سکے گی۔ لیکن بادشاہ نے کوئی پروا نہ کی اور دوسری شادی کر لی جس سے ایوان (Ivan) پیدا ہوا، جو روس کی تاریخ میں مشہور ظالم بادشاہ گزرا ہے۔

اس کے مظالم کی داستان بہت عجیب و غریب ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اسے اپنی رعایا کی جان پر بھی پورا اختیار حاصل ہے وہ راستہ چلتے ہر اُس شخص کو قتل کرا دیتا جس کی صورت اسے اچھی نہ معلوم ہوتی اور اس کے سر کو ٹھکراتا ہوا گزر جاتا۔ اس کا دماغ چلا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ اس نے ولوگڈا والوں سے کہلا بھیجا کہ ایک گھڑ بھر پسّو بھیجدیں، لیکن چونکہ پسّوؤں کی اتنی مقدار فراہم نہ ہو سکی، اس لئے اس نے اہل ولوگڈا پر سات ہزار روبل جرمانہ عاید کیا۔

ایک بار اتفاق سے فرانسیسی سفیر اس کے سامنے ٹوپی اُتارنا بھول گیا، اس نے حکم دیا کہ ٹوپی پر ایک کیل رکھ کر اس کے سر میں ٹھونک دیجائے اور جلسۂ عام میں تفریحی خونریزیاں تو اس نے اتنی کیں، کہ حد و شمار سے باہر ہیں۔

سب سے آخر میں ۱۸۱۲ء کا وہ حملہ جب نپولین نے یہاں داخل ہو کر تباہیاں پھیلائیں سبھی کو معلوم ہے، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ باوجود قسمت کی اس زبونی کے ماسکو اتنا سخت جان واقع ہوا ہے کہ وہ ہمیشہ مر مر کر زندہ ہوا اور تباہ ہو ہو کر اس نے ترقیاں کیں۔

اب ہٹلر اس پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ تاریخ پھر اپنی دیرینہ روایات کو نہ دُہرائے گی اور ماسکو اس خطرہ کا مقابلہ کرنے میں ناکامیاب رہے گا۔


# "شہوانیات" (مصنفۂ نیاز فتحپوری) کا دوسرا اڈیشن

جو نظر ثانی کے بعد مقبول عام سائز پر نہایت عمدہ کاغذ پر بہترین طباعت کے ساتھ مجلد شایع ہوا ہے۔

قیمت علاوہ محصول تین روپیہ

# نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ، جو عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا اب دوبارہ شایع کیا گیا ہے اور کاغذ و طباعت میں خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ قیمت ۸ر

منیجر نگار لکھنؤ

# مشہور شاعر، گمنام غزل گو

دنیا میں بعض لوگ ایسے بھی گزرے ہیں جو مختلف حیثیتوں سے قابل ذکر تھے لیکن دنیا نے ان کی صرف ایک ہی حیثیت کو سامنے رکھا۔ اردو کے مشہور مثنوی نگار میر حسن بھی انھیں لوگوں میں سے تھے۔ کون ہے جو مثنوی نگار کی حیثیت سے ان سے واقف نہیں اور حقیقت بھی یہی ہے کہ انھوں نے اس صنف میں جو کمال پیدا کیا وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوا۔ لیکن بہت کم لوگ ہوں گے جو ان سے بحیثیت غزل گو بھی واقف ہوں۔ بعض حضرات کو تو یہ معلوم کرکے تعجب ہوگا کہ حسن کی غزلیات کا ایک دیوان بھی ہے مگر ان کا تعجب اور حیرت بجا ہے۔ ان کی مثنوی نگاری کو اس درجہ فروغ حاصل ہوا کہ غزل گوئی ماند پڑ گئی۔ ایک زمانہ تھا جب میں بھی میر سے کچھ اسی طرح متاثر تھا ان کے کلام کے آگے دوسروں کا کلام روکھا پھیکا اور بے اثر معلوم ہوتا تھا۔ غزل گو کی حیثیت سے میر میرے دل میں حسن کی کوئی قدر نہ تھی لیکن جب ان کا دیوان نظر سے گزرا اور اس کا بغور مطالعہ کیا تو روز بروز ان کی عظمت کا سکہ دل پر بیٹھنے لگا۔ ایک بار نہیں متعدد بار ان کا کلام پڑھا اور بہت لطف اٹھایا۔ کسی شاعر کے کلام کا تنقیدی مطالعہ کرنے سے پیشتر ضروری ہے کہ اس کے ماحول کا خاکہ ہمارے ذہن میں موجود ہو اور ایک حد تک ان نظریات و رجحانات کو بھی ہم جان لیں جو اس کے کلام پر اثر انداز ہوئے ہوں اسلئے مختصراً پہلے یہ معلوم کر لیجئے:

**ماحول:** میر حسن نے بارھویں صدی ہجری میں آنکھ کھولی یہ وہ زمانہ تھا جب مغلیہ سلطنت کا نظام بگڑ چکا تھا، سلطنت کی جڑیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ بادشاہ صرف نام کا شہنشاہ رہ گیا تھا، تمام امرا و وزرا خود مختار نواب بن بیٹھے تھے، خانہ جنگیوں کا بازار گرم تھا یہاں تک کہ نادر شاہ حملہ آور ہوا اور دلی کو تاراج کرکے اپنے وطن سدھارا۔ اس کے بعد چاروں طرف مرہٹوں کی لوٹ مار شروع ہوئی اور احمد شاہ درانی نمودار ہوا اور دلی کے گلی کوچوں کو ایک بار پھر درشاہی قتل و خون کی تصویر دیکھنا پڑی۔ شہنشاہ نے دارالخلافہ چھوڑ کر الہ آباد میں قیام کیا اور مرہٹوں کی مدد سے حکومت شروع کی۔ اسی زمانہ اور اسی عہد میں دلی کے ایک گوشہ میں میر غلام حسن نامی ایک شخص پیدا ہوا جو بعد کو شاعری کی دنیا میں حسن کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے نظام سلطنت کی ابتری کے واقعات کانوں سے نہیں سنے بلکہ ان کی پلٹتی پھرتی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ دلی کو ہر طرف سے پریشانی مصیبت ہونکبت نے گھیر لیا تو دوسرے اہل کمال کے ساتھ حسن نے بھی فیض آباد کا رخ کیا اور نواب سالار جنگ اور ان کے بیٹے کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔ حسن شاعر تھے اور ایک حساس دل کے مالک، دلی کی تباہی، بربادی اور زبوں حالی کے نقشے ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ ان تمام حالات واقعات اور مشاہدات کا ان کے دل پر ایک گہرا اثر پڑا اور دوسرے شعرا کی طرح ان کے کلام میں بھی حسرت و اندوہ کا رنگ غالب ہو گیا۔ چنانچہ ان سب اثرات کی وجہ سے ان کے کلام میں یاس و حسرت، دنیا سے بیزاری، سرمایہ دارانہ نظام سے نفرت اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پیدا ہو گئیں۔

**معاصرین:** ان کے معاصرین میں میر، سودا، درد، مظہر جان جاں، ضیا، اور سوز قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ان حضرات کی صحبتیں اٹھائی تھیں، اور ایک بڑی حد تک ان کے اثرات سے متاثر بھی ہوئے تھے جس کا ثبوت ان کے کلام سے ملتا ہے۔

**شاگردی:** شاعری میں ان کو میر ضیا سے تلمذ حاصل تھا مگر استاد کے رنگ کو بخوبی نبھا نہ سکنے کی وجہ سے میر، درد اور اکثر سودا کا تتبع کرنے لگے چنانچہ اس کا تذکرہ اپنے کلیات کے دیباچہ میں بھی کیا ہے۔ ان اساتذہ کی پیروی سے ان کے یہاں ایک جداگانہ تنوع اور ہمہ گیری پیدا ہو گئی ہے

شاعری زبان اور خیال کے موزوں امتزاج کا نام ہے۔ لہذا کسی شاعر کے کلام سے بحث کرتے وقت یہ دونوں چیزیں پیش نظر ہونا چاہئے۔ ذیل میں حسن کی غزلیات کو زبان کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ میر حسن کی زبان نہایت سادہ، سلیس، لطیف اور فصیح ہے البتہ کہیں کہیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جو آج متروک ہیں۔ حسن کے کلام پر نظر ڈالئے تو اس کی سلاست، روانی اور لطافت آپ کا دل موہ لے گی۔ میں کیا۔ میں کہا۔ دیکھوں ہوں۔ دیکھے ہے۔ پرے اور ٹک وغیرہ الفاظ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ متروک ہونے کے باوجود بھی بھلے لگتے ہیں انہی الفاظ کا طفیل ہے کہ ان کے یہاں میر تقی میر کی سی دلآویزی، لطافت، نرمی اور گھلاوٹ پیدا ہو گئی ہے، وہ مٹی کی جگہ مانی، ہمیشہ کی جگہ کبنت، دیوانے کی جگہ دوانے، کبھی کی جگہ کبھو کب تک کی جگہ کبتئیں، بد دماغ کی جگہ بے دماغ استعمال کرتے ہیں مگر کلام میں بھدی نہیں آنے پاتی بلکہ عجیب کیف پیدا ہو جاتا ہے ؎

مت دست ہوس کو تو جھکا لینے کو اس کے — مانی سے سب آلود ہے اسباب جہاں کا

بت خانے میں چل بیٹھ یا کعبہ میں حسن اب — یوں کب تلک دوانے تو در بدر پھرے گا،
وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا، — سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا
یہ سب اپنے خیالِ خام تھے تم تھے پرے سب سے — جو کچھ سمجھے تھے ہم تم کو یہ سب اپنا توہم تھا
دور میں اپنے الٰہی رہے گا کب تئیں یوں، — بادہ شیشے سے جدا شیشے سے پیمانہ جدا
طبعِ نازک کے ہاتھ سے اپنے — عمر بھر میں تو بے دماغ رہا

وہ زبان پر کامل قدرت رکھتے ہیں ثقیل سے ثقیل الفاظ استعمال کرتے ہیں لیکن فقروں کے دروبست سے ان میں ایسا لوچ پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کے ثقل کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مشکل سے مشکل قافیہ اس خوبی سے استعمال کرتے ہیں کہ بدمزگی کے بجائے شعر میں اچھا خاصا لطف پیدا ہو جاتا ہے:

وہ ملکِ دل کہ اپنا آباد تھا کبھو کا — سو ہو گیا ہے تجھ بن اب وہ مقام ہو کا
لایا غرور پر یہ عجز و نیاز تجھ کو، — تیرا گنہ نہیں کچھ اول سے میں ہی چو کا،
کس مست ناز نے کل میخانہ پر نگہ کی — دیوار و در تلک بھی جو واں کا چھک رہا تھا
خورشید ہی پر اپنے منکر ہوا فلک تو — یاں داغِ دل بھی اپنا اک دن جھک رہا تھا

اسی طرح مشکل ردیفیں بھی استعمال کرتے ہیں لیکن صفائی و سادگی میں فرق نہیں آتا ہے

افتادگی ہو چاہے تو رکھ ہوشِ نقش پا — آئینہ خاکساروں کا ہے دوش نقش پا
کم حوصلہ ہیں ہم کو کہاں دید کی نظر — بے مصلحت جو ہم سے ہے روپوش آشنا
ایکدم ناقہ کو ٹھہرتا نہیں مجنوں کے پاس — خار آجائے الٰہی ساربان کے زیر پا،
کوہ و صحرا سے تو گھبرا کے لے آیا تھا مجھے — لیچلا پھر دلِ وحشی تو وہیں مجھ کو کیا

سودا کی طرح انھوں نے بھی اپنے اشعار میں ہندی الفاظ کے استعمال سے زبان کو گنگا جمنی بنایا ہے۔ مثال کے لئے ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں:

ریت گر ہے یہی اُلٹی تو بھلا آج سے ہی — ہم نے اُلفت کا تری نام و نشاں چھوڑ دیا
جاتا تھا اس کی کھوج میں میں بے خبر چلا — بارے اسی نے ٹوک کے پوچھا کدھر چلا

عشق کی گم گشتگی اور بیخودی پامال مضمون ہے مگر حسن نے بالکل نئے ڈھنگ سے باندھا ہے:-

دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا — ایک کو ایک کا سراغ رہا،

جدت ادا کی اور مثالیں ملاحظہ ہوں:

نکل اے جاں اب دل سے کہ صاحب خانہ آتا ہے — ترا تو دل ہی اُٹھنے کو نہیں کیا یہ بھی گھر جانا
کس منہ سے میرے یار کے ہوتا ہے روبرو — چہرے کے داغ اپنے تو مہتاب دیکھنا

ماہرینِ معنی و بیان نے صنائع و بدائع کو کلام کا زیور قرار دیا ہے۔ جیسے ایک خوبصورت عورت سنگھار اور گہنوں سے زیادہ حسین معلوم ہوتی ہے اسی طرح تشبیہ، استعارہ اور دیگر صنائع لفظی سے کلام کا حُسن بڑھ جاتا ہے۔ لیکن ان تمام محاسن کے باوجود اگر ان کے استعمال میں غلو کیا جاتا ہے تو کلام میں حُسن کے بجائے عیوب پیدا ہو جاتے ہیں اور شعر لفظی بازیگری کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ اُردو کے تمام شاعروں نے کم و بیش اس کو استعمال کیا ہے اور بعضوں کی لے تو یہاں تک بڑھی ہے کہ ان کے اشعار معمے اور چیستاں ہو کر رہ گئے ہیں۔ حسن نے بھی اپنے کلام کو صنایع سے زینت بخشی ہے مگر سلامتی طبع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ مثلاً:

ملگجے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اس کا بدن — دھوپ جیسے شام کی ہو اور سحر کی چاندنی
لیجائے جیسے غنچۂ پژمردہ کو صبا! — یوں آہ لے کے لختِ جگر ۔ ۔ ۔ گئی
روئے مسیح نے نمک اس میں ملا دیا — کیفیت اب رہی نہیں جام شراب میں

اُٹھا بالوں کو چہرے سے دکھا دے چاند سا مکھڑا — سرِ شام آج آتا ہے نظر تنہا مجھے تارا
اپنے عقدے کسی طرح نہ کھلے — کس دلِ آزار کی جبیں ہیں ہم
اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا — جیسے کوئی بھولے ہوئے پھرتا ہے کچھ اپنا

سطورِ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ کلام حسن کا لفظی تجزیہ ہے اب ذرا معنوی پہلو پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ان کے یہاں کیا کیا جواہر پارے بھرے ہوتے ہیں۔

**میر کا رنگ :** کہا جاتا ہے میر صاحب کا کلام داخلی رنگ لئے ہوئے، ان کا کلام آہ ہے، اس میں انتہائی درد و اثر اور سوز و گداز پنہاں ہے۔ ان کی زبان نرم، میٹھی، اور سادہ ہوتی ہے لیکن انہی نرم، میٹھے اور سادہ الفاظ میں نشتروں کی سی آبداری ہوتی ہے جس سے سامع کے دل پر ایک چوٹ سی لگتی ہے مثلاً :

سرہانے میر کے آہستہ بولو — ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا — دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا
اُن نے پہچان کر ہمیں مارا — منھ نہ کرنا ادھر تغافل تھا
دیدنی ہے شکستگی دل کی — کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

میر حسن نے میر کے تتبع میں جو اشعار کہے ہیں ان میں بھی شیرینی، سادگی، گھلاوٹ کے ساتھ ساتھ نشتریت پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان اشعار کو میر کے دیوان میں شامل کر دیا جائے تو بمشکل لوگ ان کو میر کے کلام سے علیحدہ کر سکیں گے۔ ملاحظہ ہو :

تیرا حسن یہ رونا یونہی اگر رہے گا — ظالم تو پھر کسی کا کاہے کو گھر رہے گا
جب سے جدا ہوا وہ شوخ تب سے مجھکو — نت آہ آہ کرنا اور زار زار رونا
تمھیں بھی یاد آتے ہیں وہ دن کہ کوئی دن — ہمارے حال پر کیا کیا ترحم اور تفضل تھا
رو رو کے کیا ابتر سب کام میرے دل کا — کھویا مری آنکھوں نے آرام میرے دل کا
اپنی طرف سے ہم نے تم سے بہت نبھایا — پر آہ کیجئے کیا تم نے ہمیں نہ چاہا
وصل ہوتا ہے جن کو دُنیا میں — یارب ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں میر کے بعض اشعار ایسے ہیں گویا وہ چپکے چپکے اپنے دل سے باتیں کر رہے ہیں، حسن کے یہاں بھی اس قسم کے شعروں کی کمی نہیں، مثال کے طور پر چند شعر نقل کئے جاتے ہیں :

کروں شکوہ تو بے وسواس میں اس سے نہ آنے کا — نہ ہو دھڑکا مرے دل میں مگر اس کے روٹھ جانے کا
وساطت سے کسی کی چھپ کے بھی چاہا نہ کچھ ورنہ — کیا تھا ڈھب تو یاروں نے بہت اس سے ملانے کا
حسن تو ہر کسی سے حالِ دل کہتا پھرے ہے کیوں — عبث بدنام ہوگا اور نہیں کچھ اس میں پانے کا
ملامت بھی کریں گے اور اُلٹی تجھکو ہنس ہنس کر — کوئی احوال پر تیرے نہیں افسوس کھانے کا

**سودا کا رنگ :** کبھی کبھی حسن کے اشعار میں سودا کا انداز دکھائی دیتا ہے مشہور ہے کہ سودا کی شاعری انبساطی ہے، درد و الم سے ان کو کوئی واسطہ نہیں، ظرافت و خوش طبعی ان کی جان ہے، ہشاش بشاش آدمی تھے خود بھی ہنستے اور دوسروں کو اپنے رنگین کلام سے ہنساتے۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ وہ ظرافت، ہنسی اور شوخی کے پردے میں اپنے غموں کو چھپا کر دل کی تسکین کرتے تھے۔ ان کے خیالات میں بلندی اور الفاظ میں شان ضرور ہوتی ہے لیکن وہ درد کی کسک سے بھی خالی نہیں۔ حسن بھی جب کبھی روتے روتے تھک جاتے تو دل بہلانے کی خاطر سودا کی طرح تانیں اُڑانے لگتے اور وقتی طور پر ان کے کلام میں بھی وہی مستی وہی جوش و ترنگ اور شوخی نمایاں ہو جاتی ہے :

حاصل اس باغ کے آنے کا تو ہے دید، بھلا — گلشنِ ہستی کا ہم کیونکہ تماشا نہ کریں
ترے دل سے تو مجھے بات یہ لگتی ہے بعید — تو نے کس دل سے حسن کو مری جاں چھوڑ دیا
دم رکتا ہوا آتا ہے لب تک مرے غم سے — عقدے ترے ہیں بسکہ مرے تارِ نفس میں

**سوز کا رنگ :** جب کبھی سوز کا چربہ اُتارتے ہیں تو وہی معاملہ بندی، نزاکت اور چٹکلے بازی کرنے لگتے ہیں مثلاً :

کیا مسکرا کے ٹالے ہے اب پھر کب آئے گا — دل بے قرار ہوتا ہے کچھ تو قرار کر
بزم شراب ہے اور تنہا ہے یاس مہرو — پردے ہی میں تو اپنا منھ آفتاب رکھنا
بھولے سے میں کہا تھا اس سے کہ دل ہے میرا — کہنے لگا بغل میں اب اس کو داب رکھنا
مجھ سے ہوا نشہ میں ہم آغوش آشنا — یارب اسی طرح رہے بے ہوش آشنا
دیکھ دروازے سے مجھ کو وہ پری رو ہٹ گئی — دیکھتے ہی اس کے مری جان بس چٹ پٹ گئی
پردے ہی پردے میں دل کو خاک کر ڈالا مرے — اس ادا سے وہ پری منھ پر لے گھونگھٹ گئی

**درد کا رنگ :** میر تقی میر کے بعد حسن اگر کسی دوسرے شاعر سے زیادہ متاثر نظر آتے ہیں تو وہ میر درد ہیں۔ میر درد ایک صوفی منش بزرگ تھے ان پر جو گزرتی وہی نظم کے پردے میں ظاہر کر دیتے مگر حسن نہ تو صوفی تھے اور نہ درویشوں سے ان کو کوئی خاص لگاؤ تھا۔ ان کی غزلیات میں تصوف کے جو مسایل حل کئے گئے ہیں وہ محض رسماً اور درد کی تقلید میں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ درد تک نہ پہونچ سکے، لیکن ناکام نہ رہے۔ تصوف کا ایک اہم مسئلہ ہے کہ موجود حقیقی سے تمام کائنات پیدا ہے، حسن نے اس نکتہ کو یوں بیان کیا ہے :

تو ہے تو مری جان و دل و جسم ہے ورنہ — کیسا یہ دل اور کیسا یہ جی اور میں کہاں کا

صوفیوں کا عقیدہ ہے کہ خدا ہم میں موجود ہے، وہ ہم سے بیگانہ نہیں لہذا اگر ہم اس کو پہچان نہ سکیں تو ہمارے فہم کا قصور ہے حسن بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتے ہیں :

بیگانہ ہے یہاں کون اور اپنا ہے یہاں کون — ہے سب یہ عقیدہ مرے ہی وہم و گماں کا

رضا و تسلیم : مرضی ہو جہاں اس کی وہی جا ہمیں بہتر — مشتاق دل اپنا نہیں کچھ باغ جناں کا

بے ثباتی دنیا :- جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ — آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم تھا خزاں کا

اگر انسان پیدا نہ ہوتا تو خدا ہوتا :- کرتا میں حسن قدر اس کے عالم ہی میں پرواز — ہستی کا اگر اپنی گرفتار نہ ہوتا

مسئلہ جبر :- کوئی دیتا نہیں اس بت کو دل کچھ اپنی خواہش سے — جو یوں مرضی خدا کی ہو تو پھر بندے کا کیا کہنا

**نفسیاتی عنصر :** حسن فطرت انسانی سے بھی بخوبی واقف تھے جیسا کہ ان کی مثنوی سحر البیان سے بخوبی واضح ہے۔ جس طرح مثنوی میں نفسیاتی عنصر جگہ بہ جگہ نمایاں ہے اسی طرح غزلیات میں بھی اس کی کمی نہیں۔ کہتے تو ہیں معمولی سی بات مگر نہایت نپی تلی اور یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام گہرا اثر چھوڑ جاتا ہے :-

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں — لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

روزانہ زندگی میں ہر شخص گوناگوں واقعات اور عجائب سے دوچار ہوتا ہے لیکن جب وہ ان کا عادی ہو جاتا ہے تو اس کا بات بات پر متعجب ہونا ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ غالب کہتا ہے :-

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اسی رنگ کے اور چند اشعار ملاحظہ ہوں :-

جس جا پہ تم نے باتیں کی تھیں کھڑے ہوا کر — جب دیکھنا وہ جا گہ بے اختیار رونا

اسی طرح یہ شعر بھی ہے :- درد کی بات تھوڑی سی بھی لگتی ہے بہت — ہو رہا ہے بسکہ مدت سے دل اپنا گداز

**انفرادیت :** بظاہر حسن کے یہاں کوئی انفرادی رنگ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ ان کا کلام اساتذہ کی خصوصیات کا مجموعہ ہے لیکن ان کے کلام کے بغور مطالعہ سے ان کے ایک مخصوص رنگ کا بھی پتہ چلتا ہے وہ یہ کہ ان کی اکثر غزلیں مسلسل اور بیشتر میں قطعہ بند اشعار داخل ہیں۔ میرے خیال میں تسلسل بیان ان کی انفرادیت ہے اور اسکی ایک خاص وجہ بھی ہے۔ یہ پہلے مثنوی نگار ہیں اور بعد کو غزل گو۔ مثنوی کی سب سے اہم خصوصیت ربط یا سلسلۂ کلام ہے جس میں حسن کو مہارت تامہ حاصل تھی لہذا جب کبھی یہ غزل کی طرف رجوع ہوتے ہیں تو تسلسل بیان غیر شعوری طور پر قطعہ بند اشعار کی شکل میں پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر چند غزل کی شان یہ ہے کہ اس کا ہر مضمون ایک ہی شعر میں پورا ہو جائے لیکن حسن قطعات اس حسن و خوبی سے غزلوں میں ہو دیتے ہیں کہ شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے مثال کے طور پر ایک مسلسل غزل اور چند قطعہ بند اشعار پیش کئے جاتے ہیں :

جو منھ میں آیا اس کے سو غصہ سے کہہ گیا — کچھ مجھ کو بن نہ آئی میں رو رو کے رہ گیا
آگے تو ہاں درازی تو اتنی نہ تھی کبھی — کیا جانے کس کے کہنے پہ وہ رشک مہ گیا

یہ سخت سست باتیں سنائیں کہ کیا کہوں — دریا غضب کا تھا کہ مرے سر سے بہہ گیا
قابل جو کچھ نہ کہنے کے تھا اور سننے کے — سو کہہ گیا وہ شوخ مجھے اور میں سہہ گیا
دل میں تو آئی تھی کہ حسن تو بھی بول اُٹھ — پر دل میں سوچ سوچ کچھ اپنے رہ گیا

غیروں میں دیکھ تجھ کو بیٹھے ہوئے کہیں کیا — جو کچھ کہ اپنے دل پہ گزرا سو حال گزرا
پر منصفی سے اتنا فرمایئے کہ ہارے — خدمت میں آپ کی بھی کچھ انفعال گزرا
کس تلخ کامیوں سے راتیں حسن کاٹیں — پر تو نہ اس تک اک دن شیریں مقال گزرا

یہ کیا جانے حسن تھا یا کون تھا اس کے آگے — احوال کوئی اپنا رو رو کے بک رہا تھا
تسپر جواب اس کو ملتا نہ تھا ادھر سے — بے چارہ اپنے سر کو ناحق پٹک رہا تھا

میں اک روز پوچھا جو اس شوخ سے — کہ کیوں کچھ تجھے بھی مری چاہ ہے
تو ہنس کر لگا کہنے کیا خوب کیوں — تو میرا کہاں کا ہوا خواہ ہے
یہ سنکر جو میں چپ رہا تو کہا — ابے دل کا مالک تو اللہ ہے

**سوز و گداز:** انھوں نے چھوٹی بحر میں بے شمار غزلیں کہی ہیں اور ان کی عجب شان ہے، نہ تشبیہ ہے نہ استعارہ لیکن درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے، بیشتر اشعار سہل ممتنع میں۔ چھوٹے چھوٹے الفاظ کے سریلے نغموں سے اثر و کیف مجسم ہو کر سامنے آجاتا ہے:

دل کو لیکے صنم جدا ہو گیا — اے مرے اللہ یہ کیا ہو گیا
خار سے چھوٹے پھپھولے پاؤں کے — درد ہی آخر مرا درماں ہوا
دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا — ایک کو ایک کا سراغ رہا
دل خدا جانے کس کے پاس رہا — ان دنوں جی بہت اُداس رہا
یاس کوئی مگر ہوئی تازہ! — آج پھر دل نڈھال ہے اپنا
تو خفا مجھ سے ہو تو ہو لیکن — میں تو تجھ سے خفا نہیں ہوتا
ہنسنا اور بولنا تو ایک طرف — سامنے اس کے میں تو رو نہ سکا

**فلسفہ:** اگر ان کے دیوان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو بعض بہت اہم اور کام کی باتیں ملتی ہیں، تحقیق اور کاوش کے بعد ان کے ایک فلسفہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کے خیال میں دنیا کا مسئلہ لاینحل ہے، دُنیا کے رازوں کو سمجھنا ان کے خیال میں انسان کے حیطہ امکان سے باہر ہے۔ انسان لاکھ کوشش کرے اور سر مارے مگر دنیا، غیب اور اس کے سربستہ رازوں کا انکشاف اس کے بس کی بات نہیں۔ یہ گتھیاں اس کے سلجھائے نہیں سلجھ سکتیں:-

سربستہ رہا یونہی یہ راز حرم و دیر — معلوم ہوا بھید نہ یاں کا نہ وہاں کا
ہزار حیف کچھ اپنی ہمیں خبر نہ ہوئی — تمام عمر پھرے پر مہم یہ سر نہ ہوئی
شب فراق میں رو رو کے مر گئے آخر! — یہ رات جیسی تھی ویسی رہی سحر نہ ہوئی
اپنے عقدے کسی طرح نہ کھلے! — کس دل آزار کی جبیں ہیں ہم
یہ جو کچھ قیل و قال ہے اپنا — وہم اور خیال ہے اپنا
نہ دہر ہی کو سمجھوں ہوں نہ کعبہ یہ ترا — پھرتا ہے اشتیاق لئے در بدر مجھے
کوئی دیتا نہیں تحقیق خبر اسکی حسن — پوچھتا پھرتا ہوں سودائی ساجس تس سے
ناخن نہ پہونچا آبلۂ دل تلک حسن — ہم مر گئے یہ ہم سے نہ آخر گرہ گئی

**سرمایہ داری سے نفرت :** حسن کو کبھی چین نصیب ہوا ہمیشہ پریشان حال رہے اور عسرت و تنگی میں بسر کی، انھوں نے کہیں لکھا بھی ہے "بہر حال گزراں می نمایم" اس فقرہ سے صاف ظاہر ہے کہ انھیں کبھی فراخ دستی حاصل نہ ہوئی اور ہمیشہ روپیہ پیسہ کی طرف سے پریشان رہے۔ اس عسرت اور تنگ دستی کی وجہ سے وہ سرمایہ دارانہ نظام سے ناقر ہو گئے اور اپنے اشعار میں اس کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ پکار پکار کر کہتے ہیں کہ امیروں کو غریبوں کے حال کی کیا خبر، وہ اپنی دولت کے نشہ میں چور ہیں، چلتے ہیں تو سیکڑوں ہزاروں زندگیاں ٹھکراتے ہوئے، ہنستے ہیں مگر لاکھوں کو رلا کر، وہ کیا جانے کہ غریب بیچارے کیونکر زندہ رہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے اپنی ساری عمر مصیبتوں، پریشانیوں اور غربت میں بسر کر دیں وہ کیا یاد کریں گے کہ کبھی دنیا میں بھی رہے تھے گویا کہ دنیا میں رہنا عیش و آرام کے مترادف ہے۔ ان کے دل پر ایک زبردست جذبۂ رشک طاری ہوتا ہے۔ آخر میں وہ یہ کہکر دل کی تسلی کر لیتے ہیں کہ اگر امیروں کے پاس عیش و عشرت کے سامان مہیا ہیں تو ہم غریبوں کے لئے بھی "غم و درد" کا سامان کافی ہے :۔

گلوں کو کیا خبر حالِ زارِ عندلیبوں کی — حقیقت مفلسوں کی آہ زر والوں سے مت پوچھو
وصل کا عیش کہاں پر غم ہجراں تو ہے — لب خنداں تو نہیں دیدۂ گریاں تو ہے
گو نہ ہو عیش کا سامان میسر تو نہ ہو — واسطے دل کے غم و درد کا ساماں تو ہے
کیا کریں گے یاد اس دنیا میں آکر وہ غریب — حرفِ غم میں اپنی جو اوقات ساری کر گئے

**حقایق زندگی :** ہمیں ان کے کلام میں زندگی کی بے لاگ، ٹھوس اور زندہ حقیقتیں بھی ملتی ہیں انھوں نے لوگوں کی عیش و آرام کی زندگی بھی دیکھی اور ان کا مصیبت کا زمانہ بھی۔ جب ان کے پاس پیسہ نہ رہا تو عیش کے دمانے کے سب یار و احباب رخصت ہو گئے۔ ان مشاہدات کا ردعمل ہوا اور وہ بے تحاشہ چلا اُٹھے :۔

جب تلک زر ہے تو سب کوئی ہے پھر کوئی نہیں — سچ ہے مکھی بھی رہی ہے شکر و شیر تلک
زور سے کام نکلتا نہیں بے زر کے آگے — زر بھی حربہ ہے ترا ایک بشر کے آگے
زر اگر بر سرِ فولاد نہی نرم شود — زور کا زور دھرا رہتا ہے زر کے آگے
اس زمانے میں اے حسن مت پوچھ — ہے محبت کہاں کدھر اخلاص

**اخلاقیات :** حسن اپنے اشعار کے ذریعہ ہم کو اخلاقیات کا درس دیتے ہیں، استقلال کو انسان کی سب سے اہم اور ضروری خصوصیت قرار دیتے ہیں اور شمع کی طرح ثابت قدم رہنے کی تلقین فرماتے ہیں :۔

جہاں ثابت قدم رکھنا وہاں سر سے گزر جانا — مزا ہے استقامت میں مثالِ شمع مر جانا

وہ نصیحت کرتے ہیں کہ جس شخص نے تمہارے ساتھ کبھی کوئی نیکی یا احسان کیا ہو اس کے غلام رہو اگر تمہاری رگوں میں شرافت کا خون خوش زن ہے تو اپنے مخلص کی بات کا کبھی بُرا مت مانو :۔

اپنے مخلص کی بات کا ہرگز — مت بُرا مان ہے اگر اخلاص

**خاتمہ :** سطور بالا میں حسن کی غزل گوئی پر بحث کی گئی ہے۔ ان کی مثنوی نگاری نے اس درجہ شہرت حاصل کی کہ غزل گوئی پر پردہ پڑ گیا۔ جس طرح سورج کے طلوع ہونے پر چاند اور چھوٹے چھوٹے ستارے ماند پڑ جاتے ہیں اسی طرح مثنوی سحر البیان کی شہرت کے آفتاب نے ان کی غزل گوئی کو ماند کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ وہ اچھے غزل گو بھی تھے۔ اس حیثیت سے بھی ان کو شعراء میں ایک ممتاز جگہ مل سکتی ہے۔ میرے خیال میں وہ سوز وغیرہ سے سبقت لے گئے تھے اور ان کو میر اور درد کے قریب ہی کہیں جگہ ملنی چاہئے ان کے یہاں میر۔ درد اور سودا کی خصوصیات کے علاوہ اور دلفریب خوبیاں بھی موجود ہیں ان کے اشعار سوز و گداز اور درد و اثر کے اچھے خاصے نمونے ہیں زبان کی سادگی شیرینی اور گھلاوٹ بھی قابل داد ہے۔ ذیل میں انہی خصوصیات کو مدنظر رکھ کر ایک انتخاب درج کر کے اس مضمون کو ختم کیا جاتا ہے :

جان و دل ہیں اُداس سے میرے — اُٹھ گیا کون پاس سے میرے
شاید اُٹھنے کا تم نے قصد کیا — اُڑ چلے کچھ حواس سے میرے
یار کا دھیان ہم نہ چھوڑیں گے — اپنی یہ آن ہم نہ چھوڑیں گے
کب میں گلشن میں باغ باغ رہا — میں تو جوں لالہ داغ رہا،
جو کہ ہستی کو نیستی سمجھا — اس کو سب طرف سے فراغ رہا،

دل حسن ایسے گم ہوئے کہ سدا
ایک کو ایک کا سراغ رہا

نہ میں شمع ساں سر بسر جل گیا
سراپا محبت کا گھر جل گیا،

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ
میں تماشا وفا کا دکھلاتا

روتے ہی روتے راہ میں آخر
کام اپنا تمام کر اُٹھا

حجاب عشق گر حائل نہ ہوتا
تو ملنا یار کا مشکل نہ ہوتا

نہ کرتا عشق سے گر علم تحصیل
تو کچھ تحصیل کا حاصل نہ ہوتا

ہرگز نہ ہوش آیا اس کو کبھی عزیزاں
بے ہوش ہو کے نکلا جو اس کی انجمن سے

دروازہ گر کھلا ہے اجابت کا پر حسن
ہم کس کس آرزو کو خدا سے طلب کریں

پاس ہی پاس گرد ہے دل کے
اور اب کوئی آس پاس نہیں

دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر
جی میں ہے آج جی بھی کھو آئیں،

کون گاڑا ہے نیم بسمل یاں
زلزلہ جو اُٹھے ہے عالم میں

عشق کا اب مرتبہ پہونچا مقابل حسن کے
بن گئے بت ہم آخر اس صنم کی یاد میں

گل ہے زخمی بہار کے ہاتھوں
دل ہے صد چاک یار کے ہاتھوں

ہو رہا ہے خراب خانۂ دل
دیدہ اشکبار کے ہاتھوں

دل غم سے تیرے لگا گئے ہم
کس آگ سے گھر جلا گئے ہم

بھولے سے تو نے پیار کی اک دن کہی جو بات
کرتا ہوں دل ہی دل میں اسے یاد بار بار

محمد ریاض الحق


# دی مغل لائن لمیٹڈ

## مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدّہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور بار برداری کے جہازات - بمبئی اور کراچی سے عدن - پورٹ سوڈان - جدّہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لے جاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے :- ٹرنر مارلیسن - اینڈ کمپنی لمیٹڈ نمبر ۱۶ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

# پورب اور پچھم

## دو ہواؤں کا تصادم

نام ہے پرل بک کی نہایت مشہور تصنیف کا جو اس وقت دنیا کے بہترین انتقادی ناولوں میں شمار کی جاتی ہے ۔ ہر چند مصنف نے اس میں صرف چین کو سامنے رکھ کر بتایا ہے کہ وہ مغرب کا اثر کس طرح آہستہ آہستہ قبول کر رہا ہے، لیکن دراصل یہ وہ حالات ہیں جو نہ صرف چین بلکہ تمام مشرقی ممالک میں نظر آتے ہیں۔

اس آئینہ میں آپ کو ہندوستانی خواتین کے خدوخال بھی نظر آئیں گے ۔ اور ادبیت تو خیر مسلّم ہے۔ نیاز

---

یہ باتیں بہن میں تم کو بتلاتی ہوں ۔ یہ تو ایسی باتیں ہیں جو میں اپنوں سے بھی نہیں کہہ سکتی، کیونکہ وہ اُن ملکوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے جہاں میرے شوہر نے اپنی زندگی کے بارہ سال گزارے ہیں اور پھر یہ باتیں کسی پردیسی عورت سے بھی نہیں کی جا سکتیں، جو ہماری قوم سے اور ہمارے اُس طرزِ معاشرت سے ناآشنا ہیں جس میں ہم سب پرانی حکومت کے زمانے سے زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں ۔ لیکن تم ؟ تم تو برسوں سے ہمارے بیچ میں رہتی چلی آرہی ہو ۔ اگرچہ تمھارا تعلق بھی اُنھیں غیر ملکوں سے ہے جہاں میرا شوہر مغربی علوم کی کتابیں پڑھا کرتا تھا، لیکن تم میری باتیں سمجھ سکتی ہو ۔ پس سچ کہتی ہوں، میں نے تم کو اپنی منھ بولی بہن بنایا ہے اور میں تم کو سب کچھ بتلا دوں گی ۔

میرے باعزت اجداد پانچ سو برسوں سے "سلطنت وسطیٰ" کے اس قدیم شہر میں رہتے چلے آئے ہیں ۔ اُن برگزیدہ ہستیوں میں کوئی بھی "جدید" نہ تھا اور نہ کسی نے کبھی اپنے اندر تبدیلی پیدا کرنے کا خیال کیا ۔ اُن سب نے خاموشی کے ساتھ باوقار زندگی گزاری ۔ اُن کو اپنی راست کرداری پر اعتماد تھا ۔ چنانچہ میرے والدین نے بھی، اُنھیں قدیم روایات کے نقصامین، جن کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا، میری پرورش کی ۔ میں نے اُن روایات سے علٰحدہ ہونے کا کبھی خواب بھی نہیں دیکھا ۔ میں نے گھر کی چار دیواری کے باہر کی اپنی ہی جیسی اُن عورتوں کا ذکر سُنا تھا جو مردوں کی طرح آزادی سے باہر آتی جاتی تھیں ۔ لیکن میں نے کبھی بھی اُن کے متعلق غور نہیں کیا ۔ میں تو اپنے باپ دادا کے اُنھیں پرانے طریقوں پر چل رہی تھی جن کی مجھے تعلیم دی گئی تھی ۔ باہر کی کسی بات کی مجھے کبھی ہوا بھی نہیں لگی اور مجھ کو کسی بات کی خواہش بھی نہیں تھی ۔ لیکن آج جب میں بڑے شوق کے ساتھ ان عجیب و غریب مخلوق ۔ 'جدید عورتوں' کو دیکھتی ہوں، تو میں بھی اُنھیں جیسی بن جانا چاہتی ہوں ۔ لیکن یہ تبدیلی بہن! میں اپنے لئے نہیں چاہتی بلکہ اپنے شوہر کی خاطر چاہتی ہوں ۔

میں اُس کی نظروں میں خوبصورت نہیں ہوں ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس نے چاروں سمندروں کا سفر کیا ہے اور بڑے بڑے ملکوں کی سیاحت کی ہے اور اُن دور و دراز ملکوں میں اُس نے جدید چیزوں سے محبت کرنا سیکھا ہے ۔

میری ماں ایک عقلمند عورت ہے ۔ جب میں نے اپنی زندگی کی دس بہاریں ختم کیں اور بچپن سے بڑھ کر جوان لڑکی بنی تو میری ماں نے ایک دن مجھ کو بتلایا کہ "عورت کو مرد کے سامنے پھول کی طرح پر سکوت رہنا چاہئے اور جس قدر جلد ہو سکے عورت خوبصورتی کے ساتھ مرد کے پاس سے ہٹ جائے" چنانچہ جب میں اپنے شوہر کے سامنے کھڑی ہوئی تو مجھے اپنی ماں کے الفاظ یاد آگئے ۔ میں نے اپنا سر جھکا لیا اور دونوں ہاتھ سامنے رکھ لئے ۔ میں نے اُس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دیا ۔ لیکن آہ! اُس نے تو میری خاموشی کو حماقت پر محمول کیا ۔

جب میں اپنے دماغ پر زور دیکر ایسی باتیں سوچتی ہوں، جن سے میرے شوہر کو کچھ دلچسپی ہو سکے تو اُسوقت میرے دماغ کی کیفیت دھان کے اُس سنسان کھیت کی سی ہوتی ہے جس کی فصل کاٹی جا چکی ہو ۔ جب میں تنہا بیٹھ کر کشیدہ کاری کا کام کرتی ہوں تو میں بہت سی اچھی اچھی باتیں اپنے شوہر سے کہنے کو سوچتی ہوں ۔ مثلاً یہ کہ مجھے اُس سے کسی قدر محبت ہے [illegible] یہ سمجھ کر یہ بات میں کھلے بندوں، اُس حیا سوز انداز میں کہہ سکتی ہوں، جو خوانخوار مغربی انداز گفتگو کی نقل ہو ۔ میں تو چھپے الفاظ میں کہوں گی:-

"تم نے آج طلوع آفتاب پر غور کیا ؟ معلوم ہوتا تھا کہ گویا بے جان زمین آفتاب سے ہم آغوش ہونے کے لئے اُچھل پڑی ۔ تاریکی ۔ اور پھر موسیقی

کی تان کی طرح روشنی کا جلال انگیز اُبھار۔ میرے سرتاج! میں بھی تمھارے انتظار میں، بے جان زمین ہی کی طرح ہوں۔"

یا پھر جب کنول والی جھیل میں وہ کشتی پر سیر کر رہا ہوگا تو میں اُس سے کہوں گی کہ: "کیا ہوا اگر زرد مضمحل پانی کبھی بھی یہ نہ محسوس کرے کہ چاند اس کو اپنی طرف نہیں کھینچ رہا ہے؟ اور کیا ہوا اگر چاند کی شعاعیں اپنے لمس سے اُس کی موجوں کو پھر کبھی بھی حیات نہ بخشیں؟ میرے سرتاج! تم اپنی حفاظت کرو اور بخیریت میرے پاس واپس آجاؤ۔ تمھارے بغیر میں بھی اسی پانی کی طرح زرد مضمحل اور بے جان ہو جاؤں گی۔"

لیکن جب میرا شوہر اپنے اجنبی ولایتی لباس میں میرے پاس آتا ہے تو میں یہ سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ میری شادی کسی بدیشی آدمی کے ساتھ ہوئی ہو؟ وہ بہت کم باتیں کرتا ہے اور بولتا ہے تو وہ بھی لاپرواہی کے ساتھ۔ اس کی آنکھیں تیزی سے میری طرف سے ہٹ جاتی ہیں۔ اگرچہ اُس وقت میرے جسم پر شفتالو کے رنگ کی اطلس ہوتی ہے اور میرے بال تازے تازے موتیوں میں گندھے ہوتے ہیں۔

یہ میرا دکھڑا ہے۔ ابھی میری شادی کو پورا ایک مہینہ بھی نہیں ہوا اور میں اُس کی نظروں میں حسین نہیں رہی۔

تین دن غور و فکر کے بعد بہن میں اس نتیجہ پر پہونچی کہ اپنے شوہر کو متوجہ کرنے کے لئے مجھے عیاری سے کام لینا چاہئے۔ کیا میں اُن باعزت عورتوں میں نہیں ہوں جو پشتہا پشت سے اپنے شوہروں کی نظروں میں عزت کی مالک ہوتی چلی آئی ہیں؟ سیکڑوں برس کے عرصہ میں کوئی بھی عورت ایسی نہیں پیدا ہوئی جو حسین نہ رہی ہو، سوا ایک کوئی می (Kuei-mei) کے جو عہد سنگ میں پیدا ہوئی تھی اور جس کے چہرے کو تین ہی برس کے سن میں چیچک کے داغوں نے برباد کر دیا تھا۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے کہ اس کی آنکھیں سیاہ جواہرات کی طرح تھیں اور اس کی آواز سے مردوں کے دلوں میں اس طرح ارتعاش پیدا ہوتا تھا، جیسے بہار کے موسم میں لمبے لمبے بانس ہوا کی جنبش سے ہلنے لگتے ہیں۔ اگرچہ اُس کے شوہر کے پاس اُسکی دولت و ثروت کے عین مطابق چھ داشتہ عورتیں تھیں مگر اُس کو سب سے زیادہ محبت اپنی بیوی سے تھی۔ اور میرے باپ دادا کی ماں، یانگ کیوی فی، جو اپنی کلائی پر ایک سفید چڑیا لئے رہا کرتی تھی۔ اُس کی معطر مٹھیوں میں تو پوری سلطنت تھی کیونکہ شہنشاہ "آسمان کا بیٹا" اُس کے حُسن کا دیوانہ تھا۔ میں بھی تو آخر اُنھیں باعزت عورتوں کی نشانی ہوں، میرا خون بھی تو اُنھیں کا خون ہے اور میری ہڈیاں بھی تو اُنھیں کی ہڈیاں ہیں۔

میں نے اپنے پیتل والے آئینہ میں اچھی طرح اپنے جسم کا معائنہ کیا ہے۔ میں تو سمجھتی ہوں کہ اور لوگ مجھ سے بھی کم خوبصورت ہیں۔ میری آنکھوں کی سیاہی و سپیدی، ایک دوسرے سے بہت واضح ہے۔ میرے کان چھوٹے ہیں اور نزاکت کے ساتھ اس طرح سر سے لگے ہوئے ہیں کہ جواہرات اور سونے کی بالیاں ایک دوسرے سے مل جاتی ہیں۔ کاش میرا رنگ اتنا زرد نہ ہوتا اور میری بھویں ذرا اور کنپٹی کی طرف بڑھی ہوتیں۔ لیکن میں اپنی ہتھیلی کی مدد سے ہلکی سی سرخی گالوں پر مل کر زردی کا عیب چھپا لیتی ہوں اور پلکوں پر بھی میں برش سیاہی میں ڈبو کر پھیر لیا کرتی ہوں۔

پھر تو میں کافی حسین ہو جاتی ہوں اور اُس کی آمد کا انتظار کرتی ہوں۔ لیکن جب اُس کی نگاہیں مجھ پر پڑتی ہیں تو میں محسوس کرتی ہوں کہ وہ یہ سب بالکل نہیں دیکھتا — اُس کی نظریں نہ تو لب ہی پر پڑتی ہیں نہ کہ آنکھوں پر۔ اُس کا خیال زمین پر رہتا ہے، سمندر پر رہتا ہے اور ہر اُس جگہ رہتا ہے جہاں میں نہیں ہوتی ہوں۔

جب وہ دن آیا جو زائچہ بنانے والوں نے میری شادی کے لئے مقرر کیا تھا تو سُرخ شراب بوتلوں میں بھری گئی، میزوں پر گلابی پھولدار اطلس کے میز پوش ڈالے گئے اور شادی کے کیک جو بالکل پگوڈا کی طرح بنے تھے تو میری ماں نے مجھے اپنے کمرے میں آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنے ہاتھ دھوئے اور بال از سر نو درست کئے پھر میں اپنی ماں کے کمرے میں داخل ہوئی وہ ایک سیاہ نقشی کرسی پر بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ بغل میں دیوار کے قریب اُس کا روپہلا کامدار بانس کا حقہ رکھا تھا۔ آنکھیں چار کرنے کی جرأت کئے بغیر سر جھکا کر میں اُس کے قریب کھڑی ہو گئی۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ ماں کی آنکھیں سر سے پیر تک میرا جائزہ لے رہی ہیں۔ باوجود خاموشی کے اُس کی نگاہوں کی تیز گرمی میرے دل کے اندر اُتری جا رہی تھی۔ بالآخر میری ماں نے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا۔ اُس کی بغل میں ایک چھوٹی میز پر کچھ تربوز کے بیج رکھے تھے، وہ اُن سے شغل کر رہی تھی اور اُس کا چہرہ حسب معمول ایک مبہم غم کا آئینہ دار تھا۔ میری ماں عقلمند ہے۔ اُس نے مجھ سے کہا کہ:۔ "بیٹی کیوی مین! آج تمھاری شادی اُس شخص کے ساتھ ہو رہی ہے، جس سے تم پیدا ہونے سے پہلے ہی منسوب ہو چکی تھیں۔ تم دونوں کے باپ ایک دوسرے کے دوست تھے۔ اُن میں بھائی چارہ تھا۔ اُن دونوں نے ایک دوسرے کے بچوں کے ساتھ شادی کرنے کی قسم کھائی تھی۔ اُسوقت تمھارے منگیتر کی عمر چھ سال تھی اور پھر اُسی سال تم بھی پیدا ہوئیں۔ گویا پیدا ہونے سے پہلے ہی یہ رشتہ تمھارے لئے مقسوم ہو چکا تھا اور میں نے ہمیشہ اسی مقصد کے پیش نظر تمھاری پرورش و پرداخت کی ہے۔

تمھاری زندگی کے گزشتہ سترہ برسوں میں تمھاری شادی کا یہ لمحہ ہر وقت میرے ذہن میں رہا ہے۔ وہ تمام چیزیں جن کی میں نے تم کو تعلیم دی ہے، اُن میں دو شخصیتوں کا

ہمیشہ میں نے لحاظ رکھا ہے۔ تمہارے شوہر کی ماں کا اور خود تمہارا شوہر۔ تمہاری ساس ہی کے خیال سے میں نے تم کو یہ سکھلایا ہے کہ چائے کس طرح تیار کر کے بزرگوں کے سامنے پیش کی جاتی ہے، کس انداز سے اپنے بڑوں کے سامنے کھڑا ہوا جاتا ہے اور کس طرح بزرگوں کے اعتراض اور اُن کی تعریفیں خاموشی کے ساتھ سُنی جاتی ہیں۔ میں نے تم کو سبق دیا ہے کہ ہر موقعہ پر تم کو ایک پھول کی طرح اطاعت کرنی چاہئے جو دھوپ اور بارش دونوں کے سامنے یکساں سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔

میں نے شوہر کے لئے تم کو سونرنا اور آنکھوں اور اشاروں کی زبان میں گفتگو کرنا سکھلایا۔ یہ باتیں تمہاری سمجھ میں خود بخود آجائیں گی جب اِن کا موقعہ آئے گا اور جب اُس کے ساتھ تم تخلیہ میں ہوگی۔

غرض تم ایک شریف خاتون کے فرائض سے بخوبی واقف ہو گئی ہو۔ پسندیدہ کھانے طیار کرنا تم کو معلوم ہیں۔ تم ان چیزوں سے اپنے شوہر کی اشتہا کو گرویدہ کر سکتی ہو۔ طرح طرح کے کھانے کھلا کر اپنے شوہر کو بہلائے رکھنے کی کوشش سے تم کبھی بھی باز نہ آنا۔

امیرانہ زندگی کے طور طریقے ـــــ بزرگوں کی موجودگی میں نشست و برخواست کا طریقہ، اپنے سے چھوٹوں سے گفتگو کرنے کا انداز اور دوسروں کے سامنے اپنی ساس کے استقبال کرنے کا طریقہ، یہ سب باتیں تم کو معلوم ہیں۔ میزبانی کے انداز، تبسم کی لطافت، پھولوں اور جواہرات سے بالوں کا سجانا، لبوں اور ناخنوں کا رنگنا، عطر کا استعمال اور چھوٹے چھوٹے حسین پاؤں میں جوتوں کا استعمال ـــــ آہ! تمہارے پیروں کا حُسن، تم نے بھی اس کے لئے آنسوؤں کی کتنی گراں قیمت ادا کی ہے۔ مگر اس زمانہ میں شاید ہی کسی لڑکی کے پیر اتنے چھوٹے ہوں۔ تمہاری عمر میں تو میرے بھی پیر اتنے چھوٹے نہیں تھے۔ مجھ کو امید ہے کہ تمہارے گھرانے والوں نے میرے پیام پر توجہ کی ہوگی اور تمہارے بھائی کی ہونے والی بیوی کے پیر بھی اسی مضبوطی کے ساتھ باندھے ہوں گے۔ لیکن مجھکو بیحد ڈر ہے کیونکہ میں نے سُنا ہے کہ اُس لڑکی کو چار دن کتابیں پڑھائی گئی ہیں۔ اور تعلیم اور حُسن کا کبھی ساتھ نہیں رہتا ہے اس معاملہ میں بھی مجھ کو پیام و سلام کرنا پڑے گا۔

بہر حال اگر میری بہو تمہاری ہی جیسی ہوئی تو مجھ کو کوئی شکایت نہ ہوگی۔ تم کو ستار بجانے کا قدیم فن بھی سکھلایا گیا ہے، جس کے سروں سے ہمیشہ ہماری عورتوں نے اپنے شوہروں کا دل بہلایا ہے۔ تمہاری انگلیاں اس میں کافی مشاق ہیں اور تمہارے ناخن بھی لانبے ہیں۔ مجھ کو تو تم میں کوئی ایسی خامی نظر نہیں آتی جس کے لئے تمہاری ساس کو نکتہ چینی کی ضرورت محسوس ہو۔ ہاں نکتہ چینی کا موقعہ صرف اُسوقت ہو سکتا ہے جب تمہارے اولاد نہ پیدا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں مندر میں جا کر دیوتاؤں کے سامنے بھینٹ پیش کرونگی اور گڑگڑاؤں گی کہ سال بھیتر ہی تمہاری گود بھر جائے۔

میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ مجھ کو وہ زمانہ نہیں یاد ہے جب میں بچہ پیدا ہونے اور ماں بننے کے حالات سے ناآشنا تھی۔ بچہ کی خواہش اور وہ بھی میرے ایسے گھر میں، جہاں میرے باپ کے پاس تین داشتہ عورتیں تھیں اور جن کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بچے پیدا کرنا اور اُن کی پرورش کرنا تھا، وہاں ان باتوں سے واقفیت تو معمولی باتیں تھیں۔ لیکن اس وقت خود ماں بننے کے خیال نے میرا چہرہ سرخ کر دیا، مگر میری ماں نے اس کے متعلق کچھ غور نہیں کیا۔ وہ تو مراقبہ میں بیٹھی تھی۔ پھر یکایک وہ تربوز کے بیجوں سے شغل کرنے لگی۔

"ہاں اب صرف ایک بات تم سے کہنی ہے" اُس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ ملکوں ملکوں پھرا ہے۔ غیر ملکوں میں اُس نے طب کی تعلیم حاصل کی ہے۔ میں ان باتوں سے زیادہ واقف نہیں ہوں۔ بہر حال زمانہ خود یہ باتیں تم کو بتلائے گا۔ اچھا اب تم جاؤ"

---

بہن! میری ماں نے اتنی باتیں کبھی نہیں کی تھیں۔ وہ بہت کم گو تھی۔ وہ اپنی زبان یا تو حکم دینے کے لئے کھولتی یا غلطی پر ٹوکنے کے لئے۔ اور یہی طریقہ ٹھیک بھی تھا، کیونکہ ہمارے زنانے مکان میں اُس کا درجہ سب سے بلند تھا۔ وہ گھر کی مالک تھی۔ بہن! تم نے تو میری ماں کو دیکھا ہے نا؟ وہ کتنی دبلی پتلی ہے، اُس کے چہرہ کی سنجیدگی اور اُس کا کندنی رنگ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھی دانت پر نقاشی کی گئی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ شادی سے پہلے شباب میں وہ بڑی حسین تھی۔ اُس کے ابرو پروانہ کی طرح تھے اور اُس کے لبوں میں بھی سُرخ کلیوں کی لطافت تھی۔ اور آج بھی اُس کے چہرے پر اگرچہ گوشت نہیں ہے لیکن اُس کی بیضاوی تراش قدیم عورتوں کی تصویروں کا مرقعہ پیش کرتی ہے۔ اس کی آنکھوں کے متعلق میرے باپ کی چوتھی عورت نے خوب کہا ہے کہ "اُس کی آنکھیں غم آلود جواہرات ہیں یا سیاہ موتی۔

میرے بچپن میں بھی کوئی عورت میری ماں سے زیادہ حسین نہ تھی۔ اُس کو سب باتوں کی سوجھ بوجھ تھی اور وہ اِس خاموش متانت کے ساتھ چلنے کی عادی تھی، جس سے میرے باپ کی تمام داشتہ عورتیں اور اُن کے بچے اُس کی موجودگی میں خائف رہتے تھے۔ لیکن گھر کے نوکر اگر ایک طرف اُس کی تعریف کرتے تو دوسری طرف اُس سے ناخوش بھی تھے وہ سب اُس کے پیٹ پیچھے آپس میں بڑبڑایا کرتے کیونکہ جب کبھی وہ باورچی خانے میں چوری کرتے تو اُس کو پتہ چل جاتا۔ لیکن میری ماں نے کبھی بھی نوکروں کو اُس بُری طرح نہیں ڈانٹا جس طرح میرے باپ کی داشتہ عورتیں غصہ میں اُن کو ڈانٹا کرتی تھیں۔ اگر کوئی بات میری ماں کی مرضی کے خلاف ہوتی تو صرف چند الفاظ اُس کی زبان سے نکلتے، لیکن وہ

الفاظ بیحد تند ہوتے اور اُن کا مجرم نوکر پر وہی اثر ہوتا جو برف کے ایک نوکیلے ٹکڑے کا گوشت پر ہوتا ہے۔

مجھ پر اور میرے بھائی پر وہ بیحد مہربان تھی، لیکن وہ اس کا اظہار نہ کرتی، اور یہ طریقہ ٹھیک بھی تھا کیونکہ پورے خاندان میں اُس کا درجہ بیحد اعلیٰ تھا۔ اُس کے چھ بچے پیدا ہوئے لیکن چار بچوں کو موت کے ظالم دیوتا نے بچپن ہی میں اُس سے چھین لیا تھا۔ ان حادثات نے ہم لوگوں کی وقعت اُس کی نظروں میں اور بھی بڑھا دی تھی۔ کیونکہ جب تک ہم میں سے ایک بھی باقی تھا اُسوقت میرے باپ کو قانوناً اُس سے کوئی شکایت نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ وہ ظاہر نہ کرتی لیکن در پردہ اُس کو اپنے لڑکے پر بیحد ناز تھا۔

تم نے تو میرے بھائی کو بھی دیکھا ہے نا؟ ماں کی طرح دبلا پتلا ویسی ہی نازک نازک ہڈیاں، بانس کی توخیز شاخ کی طرح لانبا اور سیدھا۔ بچپن میں ہم سب ایک جگہ رہتے تھے اور یہ اُس نے سب سے پہلے مجھے اُن حروف پر روشنائی پھیرنا سکھلایا جو میری پہلی کتاب میں بنے ہوئے تھے۔ لیکن وہ لڑکا تھا اور میں لڑکی، اس لئے جب وہ نو برس کا ہو گیا تو وہ مردانہ مکان میں رکھا جانے لگا جہاں میرا باپ رہتا تھا۔ پھر تو ہم لوگوں کی ملاقات بہت کم ہونے لگی۔ اب وہ بڑا بھی ہو گیا تھا اور عورتوں سے ملتے شرماتا تھا۔ اور میری ماں بھی اس باتوں کی ہمت افزائی نہ کرتی تھی۔

مجھ کو کبھی بھی گھر کے اُس حصہ میں جانے کی اجازت نہیں تھی جہاں مرد رہتے تھے۔ جب مجھ کو میرے بھائی سے جدا کیا گیا تو میں ایک مرتبہ شام کے دھندلکے میں خاموشی کے ساتھ اُس دروازہ کی طرف گئی جو مردانے مکان میں کھلتا تھا اور دیوار پر جھک کر باہر کی طرف اس امید میں جھانکنے لگی کہ شاید میرا بھائی باغ میں ٹہلتا نظر آجائے۔ لیکن مجھ کو صرف وہ نوکر نظر آئے جو گرم گرم کھانے برتنوں میں لئے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ جب اُن نوکروں نے میرے باپ کے ہال کا دروازہ کھولا تو قہقہوں کی آوازیں آنے لگیں، اور انھیں آوازوں میں گانے والی عورت کی سریلی آواز بھی ملی جلی تھی۔ جب دروازے بند کئے گئے تو پھر باغ میں سناٹا ہو گیا۔

میں بڑی دیر تک کھانے والوں کے قہقہے سننے کے انتظار میں کھڑی رہی اور یہ سوچ رہی تھی کہ شاید ان مسرت بخش آوازوں میں میرے بھائی کی بھی آواز موجود ہو کہ یکایک کسی نے بڑی تیزی کے ساتھ مجھ کو پیچھے کی طرف جھٹکا دیا۔ یہ میری ماں کی سب سے بڑی خادمہ وینگ ڈا تھی۔ اُس نے ڈانٹ کر کہا کہ "اب اگر میں نے دیکھا تو تمھاری ماں سے کہدوں گی۔ کسی نے آج تک ایسی بے حیا لڑکی نہ دیکھی ہوگی جو مردوں کے لئے تانک جھانک کرتی ہو۔"

"میں تو اپنے بھائی کو تلاش کر رہی تھی" میں نے لجاجت کے ساتھ کہا اور میں کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"لیکن اب تمھارا بھائی بھی مرد ہے"

چنانچہ اب میں اُس کو بہت کم دیکھتی۔ کچھ عرصہ کے بعد میں نے سنا کہ اُس نے چاروں کتابوں اور پانچوں علوم کی تعلیم حاصل کر لی ہے، اور میرا باپ اُس کو پیکنگ کے بدیشی اسکول میں داخل کرانے کے لئے بھی طیار ہو گیا ہے جس کی میرے بھائی کو بیحد خواہش تھی اور جس کے لئے اُس کو اپنے باپ کی بڑی منت وسماجت کرنی پڑی تھی۔ میری شادی کے وقت وہ پیکنگ کی نیشنل یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور ہر خط میں امریکہ جانے کی اجازت چاہتا تھا۔ ابتدا میں تو میرے والدین اس طرف توجہ بالکل ہی نہ کرتے تھے، خصوصاً میری ماں تو اس کے بہت خلاف تھی۔ لیکن میرے باپ کو جھگڑوں سے بیحد نفرت ہے، چنانچہ اس قصہ کو طے کرنے کے لئے اُس نے میرے بھائی کی خواہش قبول کر لی

میری شادی سے پہلے اُس نے اپنی دو تعطیلیں جو گھر پر گزاریں، اُن میں ایک کتاب کا وہ بہت ذکر کیا کرتا تھا جس کو وہ "سائنس" کہتا تھا۔ میری ماں ان باتوں کو بدقسمتی سے تعبیر کرتی تھی کیونکہ اُس کے خیال میں چینی شرفاء کے لئے مغربی علوم کی کوئی ضرورت ہی نہ تھی۔ دوسری بار جب وہ گھر آیا تو مغربی لباس پہنے تھا میری ماں اس بات سے بہت ناراض ہوئی۔ جب وہ اس لباس میں کمرے کے اندر داخل ہوا تو بالکل اجنبی اور غمگین سا نظر آتا تھا۔ میری ماں نے اپنی چھڑی زمین پر مارتے ہوئے غصہ سے کہا:

"یہ کیا ہے؟ آخرش یہ کونسا طریقہ ہے؟ میرے سامنے آیندہ ایسے مہمل لباس میں ہرگز نہ آنا۔"

مجبوراً اُس کو لباس تبدیل کرنا پڑا، اگرچہ یہ اُس کو بیحد گراں گزرا اور مارے غصہ کے وہ دو دن اندر نہیں آیا۔ بالآخر میرے باپ نے تنہا کر اُس کو سمجھایا اور اندر جانے کا حکم دیا۔ میری ماں بالکل ٹھیک کہتی تھی۔ چینی لباس میں میرا بھائی شاندار اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ بدیشی لباس میں اُس کی ٹانگیں کھلی رہتی تھیں اور وہ عجیب طرح کا معلوم ہوتا تھا، اس طرح کا انداز آج تک نہ تو کسی نے میرے خاندان میں سنا تھا اور نہ دیکھا تھا۔

ہاں تو اُن دونوں تعطیلوں کے موقعوں پر بھی اُس نے بہت کم باتیں کیں۔ میں اُن کتابوں سے قطعاً نابلد تھی جن کا وہ دلدادہ تھا، کیونکہ مجھے اُنھیں باتوں کے سیکھنے سے فرصت نہ ملتی تھی جن کا شادی سے پہلے سیکھ لینا ضروری تھا، پڑھنے لکھنے کا کیا سوال تھا۔

اُس کی شادی کے متعلق ہم لوگوں نے کبھی کوئی گفتگو نہیں کی کیونکہ ایک جوان لڑکے اور جوان لڑکی کے درمیان شادی کی گفتگو نامناسب تھی۔ ہاں میں نے نوکروں کی زبانی

ہمیں ضرور سنا تھا کہ وہ بغاوت کر رہا تھا اور شادی نہیں کرنا چاہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ میری ماں کو شادی کی تاریخ تین مرتبہ مقرر کر کے بڑھانی پڑی تھی۔ ہر مرتبہ میرے بھائی نے باپ کو مجبور کیا کہ دوران تعلیم میں اُس کو شادی کے لئے مجبور نہ کیا جائے۔ میں یہ ضرور جانتی تھی کہ اُس کی شادی کی خاندان کی منجھلی لڑکی سے طے ہو چکی ہے اور یہ خاندان شہر میں اپنی دولت اور عزت کے لئے مشہور ہے۔ تین پشت اُدھر ہمارے خاندان اور اُن کے خاندان سے لوگ قرب و جوار کے اضلاع کے گورنر تھے۔

ہم لوگوں نے اپنے بھائی کی منگیتر کو اب تک نہیں دیکھا تھا، کیونکہ شادی کا معاملہ میرے باپ نے اُسوقت طے کیا تھا جب میرا بھائی صرف ایک سال کا تھا۔ اور معاملہ طے ہو جانے کے بعد شادی ہونے سے پہلے تک اُن دونوں گھرانوں میں آمد و رفت کیسے ہوتی کیونکہ یہ ایک نازیبا بات تھی

ہمارے گھر میں بھی اُس لڑکی کا کوئی ذکر نہ کیا جاتا۔ میں نے صرف ایک بار بڑی خادمہ وانگ ڈاما کو دوسرے نوکروں سے کہتے سنا تھا کہ "یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے کہ لڑکی ہمارے نوجوان آقا سے تین سال عمر میں بڑی ہے۔ عمر کے لحاظ سے تو شوہر کو بڑا ہونا چاہئے۔ لیکن کیا کیا جائے، خاندان پرانا اور رئیس ہے اور پھر ——"

یکایک اُس کی نظر مجھ پر پڑی اور اُس نے خاموشی کے ساتھ اپنا کام شروع کر دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میرا بھائی شادی سے کیوں انکار کر رہا ہے۔ جب میرے باپ کی بڑی داشتہ نے یہ سنا تو ہنسکر اُس نے کہا:۔ "معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے پیکنگ میں کوئی حسین بیوی تلاش کر لی ہے"

لیکن میں یہ کبھی بھی باور نہیں کر سکتی تھی کہ میرا بھائی سوا کتابوں کے کسی اور سے بھی محبت کر سکتا تھا۔ چنانچہ زنانہ مکان کی چار دیواری کے اندر میں تنہا جوان ہو رہی تھی۔

گھر میں میرے باپ کی داشتہ عورتوں کے بھی بچے تھے لیکن میں جانتی تھی کہ میری ماں ان لوگوں کا خیال صرف غلہ تولانے کے وقت کرتی تھی جب اُس کو سونچنا پڑتا تھا کہ کتنے آدمیوں کے لئے چاول، تیل اور نمک وغیرہ دیا جائے یا پھر کبھی کبھی اُن لوگوں کے کپڑوں کے لئے چند گز سادہ آسمانی سوتی کپڑے دیدئے جاتے۔

داشتہ عورتیں تھیں بھی بڑی جاہل، وہ ہر وقت آپس میں لڑا کرتیں اور میرے باپ کی محبت میں اُن سب کا جو حصہ تھا اُس کے لئے وہ ایک دوسرے سے بیحد حسد کرتی تھیں۔ اُن لوگوں نے میرے باپ کو اپنے حُسن سے متوجہ کیا تھا، لیکن اُن کا حُسن اُس پھول کی طرح اپنی جاذبیت کھو رہا تھا جس کو موسم بہار میں توڑ لیا جائے۔ چنانچہ جوں جوں اُن کے حُسن میں کمی آتی گئی میرے باپ کی محبت بھی سرد ہوتی گئی۔ لیکن خود اُن لوگوں کی سمجھ میں یہ بات کبھی بھی نہ آئی کہ اُن کا حُسن ختم ہو چکا ہے اور وہ لوگ میرے باپ کی آمد سے کئی روز پہلے اپنے زیور اور لباس کی درستگی میں لگ جاتیں۔ میرا باپ دعوتوں کے موقعہ پر اُن سب کو روپئے دیتا اور جب کبھی وہ خوش قسمتی سے جوئے میں کافی رقم پا جاتا تو بھی اُن لوگوں کو کچھ نہ کچھ ضرور دیتا۔ لیکن یہ سب روپئے وہ لوگ بڑے احمقانہ انداز سے مٹھائیوں اور شراب پر صرف کر دیتیں جس کی وہ شائق تھیں اور جب یہ رقمیں ختم ہو جاتیں تو پھر وہ عورتیں میرے باپ کی آمد سے قبل زیور، جوتے اور لباس خریدنے کے لئے نوکروں سے قرض لیتیں۔ جب نوکروں کو بھی اس کا احساس ہو جاتا کہ اُن کے آقا کی نظروں میں اب ان عورتوں کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی ہے تو وہ بھی اُن سے نفرت کرنے لگتے اور پھر تو بڑی دقت کے ساتھ وہ قرض کی معاملت کرتے۔

سب سے بڑی داشتہ جو سب سے زیادہ پرانی بھی تھی، بیحد موٹی تھی، اُس کا چھوٹا سا چہرہ پھولے پھولے گالوں کے پہاڑوں میں چھپ گیا تھا، اُس کے ہاتھ بہت چھوٹے اور بہت خوبصورت تھے، جن پر اُس کو ناز بھی بہت تھا۔ وہ ہاتھوں کو تیل سے دھو کر ہتھیلی میں خوبصورتی کے ساتھ منہدی رچاتی اور چکنے بیضاوی ناخنوں میں سرخی لگاتی اور پھر ہاتھوں کو میگنولیا کے عطر میں اچھی طرح بساتی۔

بعض اوقات میری ماں اس عورت کے بیجا غرور سے عاجز آکر کپڑے دھونے یا کپڑے سینے کا کام اُس کو دیتی، اس معاملہ میں کچھ تھوڑی سی اُس کی بدنفسی بھی یقیناً شامل ہوتی موٹی بھدی عورت میری ماں کے حکم سے سرتابی کی تو جرأت نہ کرتی لیکن دوسری عورتوں سے کہتی کہ میری ماں اُس سے جلتی ہے اور چاہتی ہے کہ اس کا حُسن ختم ہو جائے تاکہ اُس کے شوہر کی نظروں سے وہ گر جائے۔ یہ باتیں وہ کام سے فارغ ہونے کے بعد ہاتھ صاف کرتے وقت کہتی۔ اُسوقت بہت غور کے ساتھ وہ اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتی کہ کہیں کھال موٹی یا کھردری تو نہیں ہو گئی ہے۔ میں اُس کے ہاتھ نہیں چھو سکتی تھی کیونکہ وہ بیحد گرم اور نرم تھے، بس یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مٹھی کے اندر گل کر رہ جائیں گے۔

اس عورت سے میرے باپ کو اب کوئی محبت نہ تھی لیکن جب کبھی وہ اُس کے پاس جاتا تو کافی رقم اُس کو دیدیتا تاکہ وہ صحن میں کھڑی ہو کر اپنی بھدی آواز سے اُس کو پریشان کرے اور طنز و تشنیع سے اُس کا سر نہ کھائے۔ اور پھر اُس کے دو بچے بھی تھے اس لئے وہ کچھ نہ کچھ توجہ کی یوں بھی مستحق تھی۔

اس کے لڑکے موٹے تھے، بالکل ماں کی طرح۔ وہ ہر وقت کھاتے پیتے رہتے۔ سب کے ساتھ میز پر وہ پورا پیٹ کھاتے اور پھر نوکروں کے کمروں میں گھس کر بچے کھچے کھانے کے ٹکڑوں کے لئے اُن سے لڑتے۔ میری ماں کو طبعاً سے بیحد نفرت ہے اس لئے وہ ان لڑکوں سے بہت نفرت کرتی چنانچہ وہ لوگ اُس کے ڈر کے مارے بہت ہوشیاری کے ساتھ گھر میں رہتے۔ خود میری ماں بہت کم خوراک تھی۔ وہ تھوڑا سا چاول مچھلی کے ایک ٹکڑے یا چڑیا کے ٹھنڈے گوشت کے ساتھ کھاتی اور تھوڑی سی چائے پی لیتی۔

مجھے اپنے باپ کی دوسری داشتہ کے متعلق زیادہ نہیں یاد ہے۔ وہ مرنے کے خیال سے بہت ڈرتی تھی اور اُس کے ساتھ ہی مٹھائیاں اور تل کے روغنی لڈو بہت کھاتی تھی اور جب بیمار پڑتی تو ڈر کے مارے چلاتی پیٹتی۔ اس موقعہ پر وہ پجاری کو بلا کر وعدہ کرتی کہ اگر وہ اچھی ہوگئی تو اپنے موتی جس سے وہ بال سنوارتی ہے، مندر میں چڑھائیگی اور اب کبھی بھی بدپرہیزی نہ کرے گی، لیکن اچھی ہوتے ہی وہ اپنا وعدہ بھول جاتی اور پھر وہی چیزیں کھانے لگتی۔

میرے باپ کی یہ دوسری داشتہ جو اُس کی تیسری بیوی تھی، بہت کم باتیں کرتی اور گھر کے معاملات میں بھی بہت کم دلچسپی لیتی وہ چار لڑکیوں اور ایک لڑکے کی ماں تھی۔ لڑکا سب سے چھوٹا تھا۔ ان بچوں کی طرف کوئی توجہ نہ کی جاتی اور اُن کی حالت اُن غلاموں سے کچھ ہی بہتر تھی جن کو ہم لوگوں نے خریدا تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت اپنے بچے کی تیمارداری میں گزارتی۔ بچہ بھاری اور زرد تھا، اُس کی عمر تین برس کی تھی لیکن وہ چل بھی نہیں پاتا تھا۔ وہ بہت روتا اور ہر وقت ماں کے طویل اور ڈھیلے سینے سے لٹکا رہتا۔

مجھے اپنے باپ کی تیسری داشتہ بہت پسند تھی۔ وہ سوچاؤ کی ایک رقاصہ تھی اور اس کا پیدائشی نام لاتے تھا اور یقیناً وہ لاتے اُس پھول کی طرح حسین تھی، جس کی برہنہ شاخوں سے اوائل موسم بہار میں سنہری زرد کلیاں نکلتی ہیں۔ وہ بالکل اُنھیں کلیوں کی طرح نازک و لطیف تھی۔ وہ دوسری عورتوں کی طرح اپنے گالوں پر سرخی نہ لگاتی ہاں ابرو پر ایک باریک سیاہ خط ضرور کھینچ دیتی اور لبوں پر سرخی پھیرتی۔ شروع میں ہم لوگ اُس کو بہت کم دیکھتے تھے۔ کیونکہ میرے باپ کو اس کے حسن پر بیحد ناز تھا اور ہر جگہ اپنے ساتھ اسکو لے جاتا تھا۔ میری شادی سے ایک سال پہلے اُس نے گھر پر رہنا شروع کیا تھا کیونکہ اب وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اُس کا بچہ موٹا تازہ اور خوبصورت تھا۔ وہ بچے کو محبت کے ساتھ کھلاتی اور باپ کی آغوش میں دیدیتی، گویا میرے باپ نے زیور اور جواہرات کی شکل میں اُس کو جو کچھ دیا تھا یہ اُس کا معاوضہ تھا۔

بچہ پیدا ہونے سے قبل اُس پر ہر وقت ایک سرور کی سی کیفیت طاری رہتی اور وہ ہنسا کرتی۔ ہر جگہ اُس کے حُسن کا چرچا رہتا اور یقیناً وہ حسین تھی میں نے آج تک اس سے زیادہ حسین عورت نہیں دیکھی۔ سبز ساٹن اور سیاہ مخمل کے کپڑوں کے ساتھ اپنے حسین کانوں میں جواہرات پہنتی۔ اگرچہ ہم لوگوں سے ایک گونہ اُس کو نفرت تھی مگر اس کے باوجود وہ بڑی فیاضی کے ساتھ ہم لوگوں کو مٹھائیاں اور دوسری چیزیں دیتی جو رات کی اُن دعوتوں میں اُس کو ملتیں جن میں وہ میرے باپ کے ساتھ شریک ہوتی۔ وہ خود بہت کم کھاتی تھی۔ صبح کو میرے باپ کے جانے کے بعد تل کی ایک ٹکیا اور دوپہر کو تھوڑا سا چاول بانس کی پھلیوں یا بطخ کے گوشت کے ساتھ۔ ہاں اُس کو بدیشی شرابوں کا بہت شوق تھا۔ وہ اکثر میرے باپ سے زرد پیلے رنگ کی وہ شراب خریدنے کی استدعا کرتی جس کی تہ سے نقرئی بلبلے اُٹھ اُٹھ کر اوپر کی طرف آتے ہیں۔ شراب پینے کے بعد وہ بہت ہنستی، بہت باتیں کرتی اور اُس کی آنکھیں سیاہ پتھر کی طرح چمکنے لگتیں۔ اُس کی ان حرکتوں سے میرا باپ بہت مسرور ہوتا اور اس کو رقص کرنے کا حکم دیتا۔

جس وقت میرا باپ ان دعوتوں میں ہوتا میری ماں اپنے کمرے میں بیٹھی کنفیوشش کے زریں اقوال کا مطالعہ کرتی۔ مجھ کو اپنے بچپن میں راتوں کی یہ دعوتیں کچھ پراسرار سی معلوم ہوتیں اور جی چاہتا کہ جھانک کر دیکھوں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک بار میں نے اپنے بھائی کو ڈھونڈتے ہوئے ایسا کیا بھی تھا۔ میں یہ جانتی تھی کہ میری ماں اس کو پسند نہیں کرسکتی، اس لئے مجھ کو تھوڑی سی شرمندگی بھی ہے۔

ایک رات پھر — مجھ کو اپنی اس نافرمانی پر بڑی شرمندگی ہے۔ گرمیوں کی تاریک رات تھی، میں خاموشی کے ساتھ مردانہ مکان کی طرف گئی اور جھانکنے لگی۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جذبہ میرے اندر کیوں پیدا ہوا، اس مرتبہ تو بھائی کی تلاش کا بھی کوئی خیال نہ تھا۔ ایک عجیب مبہم سا جذبہ تھا، جس نے موسم گرما کے طویل دن میں صبح سے شام تک مجھ کو پریشان و بیچین رکھا اور جب شام، گرمی، دھندلے پن اور کنول کے پھولوں کی خوشبو سے بس آئی تو زنانہ مکان کی خاموشی میں مجھکو مردنی سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے جھانکنا شروع کیا تو میرے دل کی دھڑکن بہت تیز ہوگئی۔ کمرے کے تمام دروازے کھلے ہوئے تھے اور سیکڑوں لالٹینوں کی روشنی باہر کی گرم اور ساکن فضا میں پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کمرے کے اندر لوگ چوکور میزوں پر بیٹھے کھا پی رہے ہیں اور نوکر ہر طرف کھانوں سے لبریز برتن لئے دوڑ رہے ہیں۔ ہر مہمان کی پشت پر انگور کی بیل کی طرح ایک نازک لڑکی کھڑی ہے اور صرف ایک عورت کھانے کی میز پر میرے باپ کی بغل میں بیٹھی ہے یہ لاتے تھی۔ مجھ کو اُس کا چہرہ صاف نظر آرہا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم تھا۔ جب وہ میرے باپ کی طرف گھومتی تو اس کا چہرہ موجی پھول کی طرح معلوم ہوتا۔ اس نے کچھ آہستہ سے کہا، اتنا آہستہ کہ اُس کے لب بھی مشکل ہی سے کھلے تھے، لیکن پوری محفل قہقہوں سے گونج اُٹھی۔ لیکن اُس کے تبسم کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی، وہی لطافت و نزاکت برقرار رہی اور وہ کھل کر نہ ہنستی۔

اس موقعہ پر خود میری ماں نے مجھ کو پکڑ لیا۔ وہ بہت کم اپنے کمرے سے نکلتی۔ صحن میں بھی ٹہلنے کے لئے نہ آتی، لیکن آج شاید موسم کی گرمی نے اُس کو کمرے سے نکال دیا اور اُسکی نظریں مجھ پر پڑگئیں۔ اس نے مجھے فوراً کمرے میں واپس جانے کا حکم دیا اور خود بھی میرے پیچھے پیچھے آئی۔ وہ ہاتھ میں کھجور کا پنکھا لئے تھی، اُسی سے اُس نے میرے ہاتھوں پر زور سے مار کر کہا کہ "طوائفوں کو دیکھنے کا شوق ہوا ہے"۔ اس کی نظریں بیحد حقارت آمیز تھیں۔ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

دوسرے دن اُس نے وہ دروازہ بند کر دینے کا حکم دیا اور اب پھر میں اُس طرف سے نہیں دیکھ سکتی تھی ـــــ میری ماں بھی اپنے شوہر کی تیسری داشتہ پر بہت مہربان تھی۔ گھر کے ملازمین کو اس پر حیرت بھی تھی۔ دوسری داشتہ عورتیں تو شاید اس سے خوش ہوتیں کہ میری ماں اُس کے ساتھ بھی نامہربانی سے پیش آئے، جیسا کہ گھر کی مالکہ ہونے کی حیثیت سے اُس کو کرنا چاہئے تھا۔ لیکن میری ماں شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ اُس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

میرے باپ کی تیسری داشتہ کا خیال تھا کہ بچہ ہونے کے بعد میرے باپ کی نظروں میں اُس کی وقعت اور بھی بڑھ جائے گی اور وہ برابر اپنے ساتھ اُس کو ہر جگہ لیجانا شروع کرے گا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بچہ کی پرورش کرکے اپنے حُسن کو برباد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بچہ کی پرورش کا کام ایک لونڈی کے سپرد کیا۔ اس عورت کے بھی ایک بچی تھی لیکن اُسکو ساتھ رکھنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ بڑی موٹی عورت تھی اور اُس کا دہانہ جانوروں کا سا تھا، لیکن بچہ رات بھر اس کی آغوش میں سویا کرتا اور دن بھر اُس کی گود میں پڑا رہتا۔ خود اُس کی ماں بچے کی طرف بہت کم متوجہ ہوتی۔ کبھی کبھی میلہ ٹھیلے کے موقعوں پر وہ اپنے ہاتھ سے اُس کو سرخ کپڑے پہناتی اور اُس کے پیروں میں چھوٹے چھوٹے بلی کے منہ جیسے جوتے ڈال دیتی۔ دن میں کسی کسی وقت وہ اُس کو کھلا لیا کرتی تھی اور جب وہ رونے لگتا تو جلدی سے وہ اُس کو لونڈی کی گود میں دیدیتی۔

بچہ ہونے کے بعد میرے باپ کی توجہ اُس کی طرف کم ہوگئی۔ اگرچہ قانوناً میرے باپ کی عنایتوں کا بدل اُس نے لڑکے کی شکل میں دیدیا تھا۔ اب اُس کو بھی اور عورتوں کی طرح، میرے باپ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے داؤں کرنے پڑتے۔ یقیناً اب وہ اس قدر حسین نہیں رہی تھی جس قدر بچہ ہونے سے پہلے وہ تھی اور اُس کے چکنے، موتی جیسے چہرہ سے شباب کی آب و تاب رخصت ہو چکی تھی۔ وہ سبز لبادہ پہنتی، کانوں میں کرن پھول لٹکاتی اور اُسی جھنکار کے ساتھ ہنستی۔ میرا باپ بھی ظاہرا پہلے ہی کی طرح خوش تھا لیکن جب وہ دوسری مرتبہ پھر سفر پر گیا تو اُسے اپنے ساتھ نہیں لے گیا۔

استعجاب اور غصہ نے اُس کی صورت خوفناک بنا دی تھی۔ دوسری داشتہ عورتیں مسکرا مسکرا اس کی تسلی و تشفی کر رہی تھیں اور بہت خوش تھیں لیکن میری ماں کچھ معمول سے زیادہ مہربان تھی۔ میں نے وانگ ڈاما کو خود یہ کہتے سُنا کہ:- "ہاں! یقیناً ہم لوگوں کو اب ایک کسی اور عورت کو کھلانا پلانا پڑے گا کیونکہ اب اُس کا دل اس چھوکری سے بھی بھر گیا ہے"

اُسی دن سے چوتھی داشتہ بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی۔ غصہ و غضب کی بیہم کیفیت نے اور زنانہ مکان کی خشک و بے رنگ فضا نے اُس کے اندر بد دلی کی سی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ وہ تو دعوتوں میں جانے کی اور مردوں سے تعریفیں سننے کی عادی ہو گئی تھی۔ روز بروز اُس کی اُلجھن بڑھتی گئی یہاں تک کہ ایک دن اُس نے جان ہی دینے کا ارادہ کر لیا، اگرچہ یہ قصہ میری شادی کے بعد کا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہاں ہم لوگوں کی زندگی خوشگوار نہیں تھی۔ بلکہ اس کے برعکس ہم لوگ بیحد خوش و خرم تھے اور ہمارے بہت سے ہمسائے میری ماں کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے۔ میرا باپ بھی اپنی بیوی کی ذہانت اور خانگی معاملات میں اُس کی کارکردگی کو بڑی وقعت کی نظروں سے دیکھتا۔ میری ماں نے کبھی اُس کو کسی بات پر بھی ملامت نہیں کی۔ غرض اُن دونوں کی زندگی بیحد پر امن اور باعزت تھی۔

آہ میرا پیارا گھر! ـــ میرا بچپن میری نظروں کے سامنے تصویر کی طرح گزر رہا ہے۔ وہ صحن جہاں میں کنول کی کلیوں کو تالاب کے اندر طلوع آفتاب کے وقت پھول بنتے دیکھا کرتی تھی، زنانے مکان کے کمرے جس کی پکی زمین پر بچے قلابازیاں کھایا کرتے تھے، گھر کے دیوتاؤں کے سامنے وہ مومی بتیوں کا جلایا جانا، اور پھر میری ماں کا کمرہ جہاں میں اُس کے حاکمانہ مگر نازک چہرے کو کسی کتاب پر جھکا ہوا دیکھتی اور وہاں اُس کی بغل میں ایک بھاری چھتگیری لگا ہوا پلنگ بھی نظر آتا ـــــ یہ سب کچھ میری نظروں کے سامنے ہے۔

سب سے زیادہ عزیز مجھکو مہمانوں والا کمرا تھا، جہاں سیاہ رنگ کی کرسیاں اور بھاری بھاری کوچیں پڑی ہیں اور ایک بڑی نقشی میز بچھی ہوئی ہے اور دروازوں پر سُرخ ساٹن کے پردے پڑے ہیں۔ میز کے قریب ہی دیوار پر پیلے منگ شہنشاہ کی قلمی تصویر ٹنگ رہی ہے ـــ ایک ناقابل تسخیر چہرہ اور ٹھڈی جیسے کوئی پہاڑی ٹیلہ ہو اور تصویر کے چاروں طرف ایک سنہرا ہار پڑا ہوا ہے۔ ہال کے جنوبی حصہ کی کھڑکیاں سب کی سب نقشی ہیں اور جالی کے کاغذ اُن پر چڑھے ہوئے ہیں۔ ہال کی پر عظمت تاریکی میں چاند کی روشنی اسی کاغذ سے چھن چھن کر داخل ہوتی ہے اور چھت کی بھاری بھاری کڑیوں تک پہونچ کر اُن کے سنہرے حاشیوں کو جگمگا دیتی ہے۔ اپنے بزرگوں کے اس ہال میں بیٹھ کر شام کے سکوت میں شفق کا نظارہ کرنا مجھ پر مدہوشی کی کیفیت طاری کرتا ہے۔

نوروز کے دن جب شریف عورتیں ایک دوسرے سے ملنے جاتی ہیں تو یہ ہال سجایا جاتا ہے۔ لاتعداد عورتیں رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس آتی ہیں اور پورا ہال روشنی اور قہقہوں سے لبریز ہو جاتا ہے۔ باندیاں نقرئی تشتریوں میں سب کے سامنے نوالکھات پیش کرتی ہیں۔ میری ماں متین اخلاق کے ساتھ اس اجتماع کی صدارت کرتی ہے۔ اس ہال کی پرانی کڑیاں صدیوں سے اسی منظر کو دیکھتی آئی ہیں ـــ کالے سر، سیاہ سیاہ آنکھیں، قوس قزح کے سے ریشم و اطلس، جواہرات، موتی، بالوں میں پروئے

جانے والے لعل اور ہاتھی دانت کے سے نازک ہاتھوں میں مرصع چوڑیاں۔

میرے پیارے گھر! میرے عزیز گھر!— میں خود اپنے کو دیکھتی ہوں، بھائی کے ہاتھوں سے لپٹی ہوئی ایک چھوٹی موٹی صورت صحن میں آگ کے پاس کھڑی ہے، جہاں باورچی خانے کے دیوتا روشن کئے جا رہے ہیں۔ اُن کے کاغذی لبوں میں شہد لگایا جاتا ہے تاکہ آسمانوں پر جاکر اُن کے منہ سے میٹھے بول نکلیں اور وہ یہ بھول جائیں کہ کبھی گھر کے نوکر آپس میں لڑتے جھگڑتے بھی تھے یا کبھی باورچی خانہ میں چوری بھی کیا کرتے تھے۔ دور بہت دور، نامعلوم دنیا میں بھیجے جانے والے ان قاصدوں کے خیال سے ہم میں حیرت و استعجاب پیدا ہوتا لیکن ہم خاموش رہتے۔

"اژدہے کے تہوار" کے موقعہ پر میں اپنے کو دیکھتی ہوں — جسم پر پیازی ریشم کا میرا وہ گاؤن ہے جس پر خوبصورتی کے ساتھ انار کی کلیاں کڑھی ہیں اور میں بیتابی کے ساتھ شام کا انتظار کر رہی ہوں جب میرا بھائی مجھے دریا کے کنارے "اژدھے کی کشتی" کی سیر کرانے لے جائے گا۔

مجھے کنول کی طرح وہ قندیل یاد آتی ہے جو میری بوڑھی دایہ چراغوں کے تہوار کے موقعہ پر میرے لئے لایا کرتی تھی اور جس کو دیکھ کر میں اس خیال سے بے ساختہ کھلکھلا اُٹھتی تھی کہ رات کو میں اس کی سُرخ مومی بتی روشن کروں گی۔

مجھ کو اپنی ماں کے ساتھ آہستہ آہستہ عظیم الشان مندر کی طرف جانا یاد آتا ہے۔ وہ لوٹے میں خوشبودار پانی ڈالتی ہے اور میں اس کو غور سے دیکھتی ہوں پھر میں اپنی ماں کے ساتھ زاہدانہ انداز میں زانو کے بل جھک جاتی ہوں اور خوف میرے اندر سرد ہو جاتا ہے۔

---

بہن! میں تم سے پوچھتی ہوں کہ جب اس فضا میں میری ابتدائی زندگی کے ماہ و سال گزرے ہیں تو میں اپنے شوہر جیسے انسان کے لئے کیونکر موزوں ہو سکتی ہوں؟ میری تمام محنتیں ضایع گئیں۔ میں تنہائی میں سوچتی ہوں کہ آج اپنا سیاہ کوٹ پہنوں گی جس میں چاندی کے بٹن جڑے خوبصورتی کے ساتھ ٹانکے گئے ہیں، بالوں میں پھولوں کا ہار گوندھوں گی اور پیروں کو نوکدار سیاہ ساٹن کے جوتوں سے آراستہ کروں گی۔ اور جب وہ آئے گا تو میں اس کے استقبال کے لئے کھڑی ہو جاؤں گی — لیکن جب وہ آتا ہے تو اس کی نظریں ان میں سے کسی چیز پر نہیں پڑتیں بلکہ تیزی کے ساتھ خطوط اور کتابوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں اور میں فراموش ہو جاتی ہوں۔

میرا دل ایک نامعلوم خون سے لبریز ہے۔ مجھے اپنی شادی سے قبل کا وہ دن یاد آتا ہے جب میری ماں نے اپنے تیز ہاتھوں سے دو خط لکھے تھے، ایک میرے باپ کے نام اور دوسرا میری ساس کے نام اور بہت جلدی جلدی دربان کی معرفت اُن کو روانہ کیا تھا۔ میں نے اس قدر پریشان اُس کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اُسی دن میں نے گھر کی نوکروں کو کانا پھوسی کرتے سُنا کہ میرا شوہر اس نسبت کو توڑنا چاہتا ہے کیونکہ میں جاہل ہوں اور میرے بھیرے ہیں۔ میں یہ سُن کر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور وہ سب گھبرا اُٹھیں اور قسمیں کھانے لگیں کہ یہ باتیں وہ میرے متعلق نہیں بلکہ میرے باپ کی دوسری داشتہ کی لڑکی کے متعلق کر رہی تھیں۔

میں عجیب پیچ و تاب کے ساتھ اس معاملہ پر غور کرنے لگتی ہوں۔ کیا یہ لوگ واقعتاً میرے ہی متعلق باتیں کر رہے تھے؟ نوکر تو ہمیشہ کے جھوٹے ہوتے ہیں اور میں بالکل بے پڑھی بھی نہیں ہوں۔ مجھ کو امور خانہ داری کی پوری تعلیم دی گئی ہے اور بننے و سنورنے کا ہنر بھی سکھلایا گیا ہے۔ رہ گیا میرے پیروں کا سوال، یقیناً کوئی بھی بھاری، موٹے اور مردوں جیسے پیر پسند نہ کرے گا۔ یہ لوگ یقیناً میرے متعلق باتیں نہیں کر رہے تھے... اس کا میری ذات سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

(ترجمہ) محمد عتیق صدیقی


## مطبوعات طاق نسیاں

**خواب کی دُنیا:** - اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمائیے جس میں مولانا عبدالمالک آروی نے فرائیڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ

**الہامات شاد:** - شاد عظیم آبادی کے رتبۂ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمائیے۔ قیمت ۸ر

**مقام محمود:** - مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت پانچ روپیہ (مصر)

**اقبال کی شاعری:** - یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اس کی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنہ (مصر)

ملنے کا پتہ: انجمن لکھنؤ

# نقد پر نقد

جنوری و فروری ۱۹۴۱ء کے نگار میں اکتیس غزلگو شاعروں کا انھیں کا منتخب کردہ کلام شایع ہوا تھا۔ ایک سال بعد جنوری و فروری ۱۹۴۲ء کے نگار میں اُس کلام پر پانچ حضرات نے نقد و تبصرہ کیا۔ نیاز صاحب نہیں چاہتے کہ یہ فتنہ یہیں فرو ہو جائے بلکہ نقد الانتقاد کا باب اضافہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ شاعروں کے زمرے میں بدنام ہو چکا، اب نقاد کی حیثیت سے باری ہے!

پہلا مضمون پٹنہ یونیورسٹی کے پروفیسر کلیم الدین احمد صاحب کا ہے۔ موصوف نے غزل کو "نیم وحشی صنف ادب" کا خطاب دیا ہے، وجہ یہ بیان کی ہے کہ اس کی "صورت" ناقص ہے "صوری حسن" کا فقدان ہے۔ پروفیسر صاحب غالباً سوچتے انگریزی میں ہیں اور ترجمہ اُردو میں کرتے ہیں، ورنہ اس مطلب کے اظہار کو کہ "غزل کے اشعار میں تسلسل خیال نہیں ہوتا، ایک ہی جذبہ یا تجربہ کے متعدد پہلوؤں پر روشنی نہیں ڈالی جاتی بلکہ منتشر خیالات نظم ہوتے ہیں" "صورت" سے تعبیر نہ کرتے۔ غزل کی صورت کا تعلق اشعار کی ترتیب سے ہے نہ کہ نفس مضمون یا خیال سے لہٰذا اُس کی صورت کو ناقص کہنا مہمل سی بات ہے۔ یا پھر لفظ صورت "معنی" کے مقابل استعمال ہوتا ہے اور اس سے مراد شعر کے ظاہری محاسن یا معائب (معنویت سے قطع نظر) ہوتے ہیں، سلاست، روانی وغیرہ یا انھیں کی نفی۔

اُن کی تحریر کا پورا ابتدائی حصہ جس میں تہذیب اور بربریت کا فرق دکھانا چاہا ہے ایسا ہی مبہم اور مغلق ہے۔ اس خامی کا احساس شاید اُن کو بھی تھا کیونکہ لفظ صورت اکثر جگہ واوین میں لکھا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ خود بھی مطمئن نہیں کہ انگریزی لفظ فارم ( Form ) کا برمحل ترجمہ "صورت" ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں کہ غزل کا صوری حسن ہمارے دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا، نیز یہ کہ اگر غزل کے ہر شعر کو مکمل اور مختصر نظم تسلیم کر لیا جائے تو بھی غزل میں صوری حُسن کا فقدان ہوگا اور غزل کی صورت ایسے مجموعہ کی ہوگی جس میں مختلف نظمیں اکٹھا کی گئی ہوں۔ پھر مختلف غزلوں کے منفرد شعر لے کر فرمایا ہے کہ اگر غزل میں یہ صوری حُسن موجود ہوتا تو یہ اشعار اس طرح غزل سے الگ نہیں کئے جا سکتے تھے اور اگر انھیں الگ کیا جاتا تو پھر ان کے حُسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا۔ یہ منطق میری سمجھ میں نہ آئی۔ جب غزل کے مفرد اشعار میں حُسن ہوتا یا ہو سکتا ہے (یہ مفہوم اُن کے الفاظ "تو پھر اُن کے حسن کا زیادہ حصہ مفقود ہو جاتا" میں مضمر ہے) تو یہ کہنا درست نہیں کہ غزل میں حُسن کا فقدان ہوتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں کہ غزل کا صوری حسن دماغ کو جمالیاتی تسکین نہیں بخشتا، جس کا یہ مطلب ہوا کہ غزل میں صوری حُسن ہوتا تو ہے لیکن جمالیاتی تسکین کے لئے ناکافی ہے، دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ غزل میں صوری حُسن کالعدم ہے! یہ تناقض اس امر کا مزید ثبوت ہے کہ وہ الفاظ کا مفہوم متعین نہیں کر سکتے، کہنا چاہتے ہیں کچھ اور کہتے ہیں کچھ۔ ایسی متعدد مثالیں اُن کے مضمون میں ملتی ہیں۔ بعض کی طرف آیندہ بھی توجہ دلائی جائے گی۔

اُن کا یہ فرمانا بھی صحیح نہیں کہ غزل کا دائرۂ عمل چند خیالات تک محدود ہے۔ اس میں کیا کچھ نہیں کہا گیا اور کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ایک بیّن مثال لیجئے:۔

پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں ایک جگہ یہ عبارت رقم فرمائی ہے:۔

"مہذب آرٹ کی بنیاد فہم و ادراک پر ہے جو قدر و قیمت میں پُرجوش تجربات سے بلند تر ہیں، وہ اپنے تجربات الگ تھلگ رہ کر دیکھتا ہے اور ان پر غور و فکر کرتا ہے اور وقتی طور پر وہ قارئین کو بھی اپنی بلند سطح پر لے جاتا ہے اور انھیں حسیات سے نجات دلا کر غور و فکر سے شناسا کرتا ہے"!

اثر ستان ۱۹۲۳ء میں شایع ہوا، اُس میں یہ شعر موجود ہے:۔

شاعر کی طرح دور ہی سے کر مشاہدہ — اندوہ مرگ و زیست میں تو مبتلا نہ ہو

پروفیسر صاحب کے زیر نظر حصۂ مضمون کا غالباً یہ منشا ہے کہ غزل میں مجموعی حیثیت سے وہ حُسن نہیں ہوتا جو دوسری نظموں یا ڈراموں وغیرہ کی لازمی صنفی خصوصیت ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ غزل میں منتشر و پراگندہ خیالات ایک خاص ترتیب کے ماتحت (مطلع، قافیہ، ردیف، مقطع) یکجا کر دئے جاتے ہیں، یہ خیالات آپس میں مربوط نہیں ہوتے نہ ان میں کسی تصور یا جذبے یا تجربے کی وہ تدریجی تحلیل و تکمیل ہوتی ہے جو مسلسل منظومات میں پائی جاتی ہے، نیز یہ کہ غزل کو یہ بات اُس حالت میں بھی حاصل نہ ہوگی اگر اسکے ہر مفرد شعر کو بجائے خود مکمل نظم فرض لیا جائے۔ یہی الزام نظم پر بھی عائد ہوتا ہے، اس کا بھی ہر شعر یا مصرع حسین نہیں ہوتا اور جو حسین ہے وہ نظم سے علیحدہ بھی حسین ہے، مثلاً ورڈزورتھ کی ایک نظم کا یہ ٹکڑا۔

FAIR, AS A STAR WHEN ONLY ONE
IS SHINING IN THE SKY.

انگریزی نظموں سے ایسی کتنی ہی مثالیں پیش کیجا سکتی ہیں۔ اگر نظم کے پیمانے میں ایسے جاذب توجہ مفرد شعر یا ٹکڑے ہوسکتے ہیں تو غزل میں اُن کی موجودگی اور خوبی سے انکار مغرب کی اندھی تقلید اور تنگ نظری نہیں تو کیا ہے۔ دیدۂ بینا گلاب کے پورے تختے سے بھی لطیف ہوتا ہے اور ایک پھول بلکہ پنکھڑی کا مشاہدہ بھی سامان عشرت مہیا کرتا ہے۔

طویل نظم ہو کہ شعر واحد، دو یا زیادہ اشعار کا قطعہ ہو، رباعی ہو، یا ہزار شعر کی مثنوی، حسن و قبح کا صحیح اندازہ اور انحصار صرف اس اصول کے ماتحت ہوگا:۔

(۱) کیا کہا (۲) کن الفاظ میں کہا (۳) جو کچھ کہا اُس کی قدر و قیمت کیا ہے؟

نمبر ۱ کا تعلق شعر یا نظم کی مجموعی تعمیر و تکمیل اور جزوی ترتیب سے اُس کا مفہوم متعین کرنے اور اُس میں جو اشارے ہیں اُن کے سمجھنے سے ہے۔ اس سلسلہ میں ترنم الفاظ اور لہجے کو خاص اہمیت حاصل ہے ـــ نمبر ۲ کا تعلق طرز و اسلوب بیان سے ہے جو مفہوم سے نہ صرف مربوط اور مناسب حال ہو بلکہ اُس میں اُپج اور بانکپن بھی ہو۔ اُپج اور بانکپن میں سادگی و پُرکاری دونوں شامل ہیں ـــ نمبر ۳ کا فیصلہ یوں ہوگا کہ شاعر کے جذبات یا تجربات یا وہ "آفریدگان تخئیل" جنھیں اس طرح محسوس کیا گیا ہے کہ جزو تجربہ بن گئے ہیں کتنے شدید اور کس حد تک شاعر کے انفعالی تاثرات کے آئینہ دار ہیں۔ علاوہ بریں اُن میں کہاں تک حسن و صداقت ہے اور اظہار میں باوصف انفرادیت کتنا خلوص ہے۔

اس کے سوا جو کچھ ہے پوچ باتی ہے، ناقد کی ہو کہ شاعر کی۔ میرا ذاتی تجربہ یہ ہے کہ اچھے مفرد شعر کی خوبیوں پر غور کرنے سے جو ایک غیر مختتم جمالیاتی لہر اُٹھتی اور پھیلتی چلی جاتی ہے وہ اُس سرت سے کہیں بڑھکر ہوتی ہے جو کسی پوری نظم کے پڑھنے کے دوران میں یا خاتمہ پر حاصل ہوتی ہے۔ غزل کے اشعار کا یہی اشاراتی حسن ہے جو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ ایک شعر پڑھئے اور اُس کی رَو میں بہتے چلے جایئے، کئی بار ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میں نے میر کا ایک شعر لیا ہے اور اُس کو رات رات بھر دہرایا اور پندرہ سے زیادہ نوشیں پایا ہے۔ نظم میں طویل ہو یا مختصر یہ جادو ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کو ختم کرنے کی خواہش فطری ہے۔ بیچ بیچ میں بعض اجزا ٹھہرنے کی دعوت دیتے ہیں، آپ اُن کا پیش کردہ جرعہ چڑھا کر آگے بڑھتے ہیں نظم ختم کرنے پر (اگر صناعی کا عمدہ نمونہ ہے) آپ ایک پُرسکون لذت یا لطیف بے چینی محسوس کرتے ہیں اور بس۔ نظم وہ شدید محویت اور والہانہ سرخوشی مہیا نہیں کر سکتی جو غزل کے کسی عمدہ شعر کا جوہر ہے جس میں کشش، تڑپ، لذت، حسن اور نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے۔

غزل کے اشعار میں تنوع ہونے سے ایک ضمنی فایدہ یہ بھی ہے کہ ہر پڑھنے والے کے لئے اُس کے مذاق یا اُفتاد طبع کے مطابق یا ایک ہی شخص کے مختلف اوقات میں بدلتے ہوئے کیفیات مزاج کے لئے سامان دلبستگی موجود ہونے کا امکان ہے۔ نظم کا تسلسل ایسا گوناگوں سامان تسکین و تفریح فراہم کرنے سے عاجز ہے۔ علاوہ بریں غزل سے حسب حال شعر کا انتخاب اتنا مشکل نہیں جتنا حسب حال نظم کا انتخاب مشکل ہے۔

کامیاب سے کامیاب نظم از اول تا آخر مرصع نہیں ہوتی بلکہ جواہر پارے اِدھر اُدھر بکھرے ہوتے ہیں، تاہم یہی آنکھ مارتے ہوئے تارے پوری نظم کی جان ہوتے ہیں، یہی یاد رہ جاتے ہیں اور پوری نظم کو مشہور اور لافانی بنا دیتے ہیں۔ غزل کے دامن میں بھی ایسے لعل و گوہر ملتے ہیں، بیشتر اشعار غزلوں ہی کے ہیں جو ضرب الامثال بنکر زبان ہو گئے ہیں اور اس کی وسعت میں اضافہ کر دیا ہے۔ ایسی مفید اور دلکش اور مقبول صنف کلام کو ترک کرنے کا مشورہ دوستی کے پردے میں دشمنی ہے، اسی طرح غزل کو مسخ کر کے نظم کی بگڑی شکل بنا دینا بھی دانشمندی سے دور ہے۔ یہ ضرور ہے کہ متغزلین "دست و بلبل و دامان گل"[1] کی طرح اُگتے چلے آتے ہیں اور صحن غزل "نمونۂ یوم الحساب" بن گیا ہے۔ اس کثرت سے گھبرانا نہ چاہیئے، زمانہ ہر شاعر کی عمر شعری مقرر کرنا خوب جانتا ہے۔ کچھ باقی رہ جائیں گے، باقی بھلا دئے جائیں گے۔ اس بقا کی بھی ایک مدت معین ہوگی۔

اب غزل اور نظم کی مجموعی ہیئت پر غور کیجئے۔ اگر نظم کا حسن ایک لڑی میں متعدد موتی پرونا ہے تو غزل کا حسن ایسا زیور طیار کرنا ہے جس میں مختلف رنگوں کے جواہر جڑے ہوئے ہوں کے باوصف نگوں اور اُن کے رنگوں اور تراش و خراش میں ایسا توازن اور تال میل ہو کہ ہر نگ الگ الگ بھی حسن دے اور اُن کا باہمی خوشگوار امتزاج نیز اُس زیور کی ساخت صنعت کا ایک شاہکار پیش کرے۔ اسے غزل کے اشعار کی ہم آہنگی کہتے ہیں۔ اختلاف میں اتحاد اور اتحاد میں اختلاف جو ارتقا یا تکمیل صناعت کی آخری نہ سہی بلند منزل ہے۔

پروفیسر صاحب نے غزل کو نظم کے معیار سے جانچا، نتیجہ وہی ہوا جو ہونا تھا، یعنی ترکستان پہونچ گئے!

غزل کو ناقص کہنے والے تاریخ اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند کر کے بحث کرتے ہیں۔ مغرب کا شاعر اعظم گیٹے حافظ سے اتنا متاثر ہوا کہ اُسی طرز کا "دیوان" مرتب کیا۔ جذبات نگاری کے لئے غزل سے بہتر کوئی صنف نہیں، یورپ میں فرانسیسی شاعری اس بنا پر وقیع ہے کہ جذباتی شاعری ہے۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ قدیم یونان کی شاعرہ سیفو کے کلام میں جذبات کی جو بھڑکتی آگ ہے اُس کی نظیر بعض فارسی اور فرانسیسی شعرا کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ ظاہر ہے کہ لکھنے والے کے ذہن میں فارسی کی غزلیں تھیں نہ کہ اور کوئی صنف سخن۔

[1] میر کا شعر ہے:۔ اُگتے تھے دست بلبل و دامان گل بہم صحن چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

اور تو اور اُردو کے مایۂ ناز غزل گو شاعر غالب کا یہ شعر اس دعوے کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے کہ وہ غزل سے بیزار تھا!

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

حالانکہ شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ غالب غزل کہتے کہتے تجمل حسین خاں کی مدح پر جھک پڑے، مدح کے لئے قصیدہ مختص ہے، غزل میں اس کی گنجایش نہیں لہٰذا معذرت کے طور پر مندرجۂ بالا شعر تمہید میں پیش کیا، اس غزل پر ایک سرسری نظر ڈالئے اور "غلطیہائے مضامین مت پوچھ" کہکر خاموش ہو جایئے:

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیر دولت و دیں اور معین ملت و ملک — بنا ہے چرخ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اُس کے ہے محوِ آرایش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا — صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

یہ غزل اور قصیدہ کا خلط مبحث تھا جس کے لئے پہلے معذرت کی گئی اور پھر تفاخرانہ انداز میں اپنے فعل کو سراہا بھی گیا۔

یہ بھی غلط ہے کہ فارسی اور اُردو کے سوا غزل کا کسی زبان میں وجود نہیں۔ میں نے انگریزی کے ذریعہ سے ترکی غزلوں کا مطالعہ کیا ہے۔ جدید انگریزی شاعروں نے غزل کے عنوان کے ماتحت طبع آزمائی کی ہے۔ گجراتی زبان میں غزلیں جب چاہے ریڈیو پر سُن لیجئے۔ ہندی زبان پر بھی اس کا جادو چل چکا ہے۔ مگر ہمارے مغرب زدہ ادیب غزل کو نیست و نابود کر دینا چاہتے ہیں۔ جہاں تک صنف کلام کا تعلق ہے غزل پر کوئی الزام عاید نہیں ہوتا اور اس کو "صوری حُسن" سے محروم کہنا (صوری حُسن سے فاضل پروفیسر کا جو کچھ بھی مطلب ہو) ایک بے معنی سی بات ہے۔ مضامین کی نوعیت، اُن کی بلندی یا پستی، اسلوب ادا میں سلیقہ یا بے عنوانی ان کی نسبت جو چاہے کہئے۔

کسی نے بڑے پتے کی بات کہی کہ غزل سب سے آسان اور اُسی کے ساتھ سب سے دشوار صنف کلام ہے۔ ردیف اور قافئے کے سہارے اندھے کی طرح ٹٹولتے ہوئے کہیں پہونچ جانا (دلدل ہی کیوں نہ ہو) آسان ہے، مگر جس کے پہلو میں دل ہے اور اُس کی روشنی میں کائنات اور حقایق حیات پر غور، نیز اپنے اور دوسروں کے نفسیات اور گردوپیش کی اشیا کا مطالعہ کیا ہے وہ ردیف و قافیہ یا تنہا قافیے کی پابندی صرف اس لئے کرتا ہے کہ خیال کے دوسرے محرکات جو زیر نظر ردیف و قافیہ سے وابستہ نہیں ہیں اُتنی دیر کے لئے معطل ہو جائیں اور خیال کا ایک (وقتی) مرکز ثقل قایم ہو جائے۔ اگر خیال میں دم اور جولانی نہیں تو شعر ردیف اور قافیہ کی "ٹکر گدائی" سے آگے نہ بڑھیگا۔ ایسا شعر اُنھیں کو پسند بھی آئے گا جن کے شعوری تجربہ میں گہرائی نہیں۔ مثال کے طور پر موضوع عشق کو لیجئے، جو شاعر اسے ہوس پرستی یا جنسی تحریک سے الگ نہیں سمجھتا اُس کے اشعار میں ایسے ہی واقعات کی عریاں مصوری ہوگی اور اُس کے ہمخیال ایسے اشعار پر سر دھنیں گے، مگر جس نے عشق کیا ہے اور عشق پر غور کیا ہے وہ عشق کو (قطع نظر اس سے کہ حقیقی ہو یا مجازی، یہ تفریق ہی لغو ہے) آلودگی سے ہمیشہ پاک رکھے گا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ شاعری محض نقالی یا بیان واقعہ نہیں بلکہ بحیثیت "فن لطیف" اس کا منصب اولین ترجمانی اور بلند نظری کے علاوہ زندگی کے مشاہدات اور اہم عناصر کو سطحی قدروں سے علٰحدہ اور ممیز کرنا بھی ہے۔ ایسا عاشق یا شاعر باوصف مقدور حصول مقصود سے دستکش رہتا ہے، معشوق کو "رضائی" میں گھس آنے کی دعوت نہیں دیتا۔ واردات عشق کا صناعانہ تجزیہ کرتا ہے اور تصویر کے وہ نقوش جو محض مادی خواہشات کے مظاہر ہیں خارج کر دیتا یا دھندلے چھوڑ دیتا ہے۔ میر کا یہ شعر لیجئے:-

ساعد سیمیں دونوں اُس کے ہاتھ میں لاکر چھوڑ دئے — بھولے اُس کے قول و قسم پر ہائے خیال خام کیا

یہی عاشقی ہے اور یہی شاعری ہے۔

میر ہی دوسرا معیار قایم کرتا ہے:-

دونوں طرف سے دیدہ و در آئی نہیں ہے خوب — اس چاہ کا ہے لطف جو آپس میں ڈر رہے

میر پر موقوف نہیں اور شاعر بھی اس راز کے محرم گزرے ہیں

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اُٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

نظام (رامپوری) کا سلیقہ نہ ہو تو یہی شعر مبتذل ہو جائے۔ دلکشی کا راز انگڑائی کی ادا میں نہیں بلکہ معشوق کی حیا پروری میں ہے کہ ایک اضطراری کیفیت یعنی انگڑائی کو ایک محرم کے سامنے بھی ٹال دیتا ہے لیکن معاً خیال آتا ہے کہ اس ٹالنے میں عشق کی سچائی اور صفا کیشی پر عدم اعتماد کا پہلو نکلتا ہے جس میں عاشق کی خاطر شکنی مضمر ہے۔ لہذا تبسم سے تلافی کر دیجاتی ہے۔ ایسی ویسی ہزار نظمیں اس ایک شعر پر قربان ہیں۔ اس کے بعد یہ شعر نقل کرنے کو دل نہیں چاہتا مگر مطلب واضح کرنے کو تقابل ناگزیر ہے۔ گو اُبکائی آتی ہے اور "حول" پڑھنا پڑتی ہے:۔

دکھائی دے کے انگڑائی مجھے زنجیر ہونے کی — اشارہ تھا کہ نیند آئی، کرو تدبیر سونے کی!

اب اسی پر کوئی ہاتھ ملے اور زانو پیٹے تو اُسے اختیار ہے — غالب کا یہ شعر لیجئے:۔

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں — جس کے بازو پر تری زلفیں پریشاں ہو گئیں

یہ "نیند اُس کی ہے" کا ٹکڑا ہے جس نے شعر کو صناعی کا قابل رشک نمونہ بنا دیا۔ حالانکہ ہوس کا موکل کہیگا کہ ایسے موقع پر نیند کہاں!

اسی کے ساتھ غالب ہی کا یہ شعر پڑھئے اور صلواتیں سُنائیے!

پنس میں گزرتے ہیں جو وہ میری گلی سے — کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

تکدر دور کرنے کو میر کا ایک شعر اور سُن لیجئے:۔

بھاتی ہے مجھے اک طلب بوسہ میں یہ آن — لکنت سے اُبل جا کے اُسے بات نہ آئی

طلب بوسہ، ہوس و لذت بوسہ سے بے نیاز ہو کر "لکنت سے اُبلنے" اور "بات نہ آنی" کی آن کے مزے لوٹتی ہے۔ یہی عشق اور ہوس میں فرق ہے۔

جس شخص نے شاعری کی اس فضا میں سانس لی ہے، فطرت اور نفسیات کا مطالعہ جس کا محبوب ترین مشغلہ رہا ہے اور بدقسمتی سے خود بھی شعر کہتا ہے، اُس کے لئے عجیب مشکل کا سامنا ہے۔ کیا کہے اور کیا نہ کہے:۔

کہوں تو کیا کہوں، کس سے کہوں، کہنے سے کیا حاصل — خموشی پر مری بے درد جو چاہے گماں کر لیں

مگر جب "ناز فرمائی"، "نیاز چین لینے دے!

مجھے امید تھی کہ غزل کو مردود قرار دینے کے بعد پروفیسر صاحب نظم گو شعرا کا حوصلہ بڑھائیں گے، مگر نہیں، سنئے!

"نظمیں تو اُردو میں بہت ملتی ہیں لیکن شاید ہی کوئی نظم صحیح معنوں میں نظم کہی جا سکتی ہے"

اس تمہید کے بعد وہ بزم نگار میں شریک ہونے والے شاعروں کو پانچ جتھوں یا گروپ میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلے گروپ میں وہ شاعر ہیں جو زیادہ تر نظمیں کہتے ہیں۔ انکی تفصیل یہ ہے:۔ (۱) احسان دانش۔ (۲) علی اختر اختر۔ (۳) اختر شیرانی۔ (۴) جوش ملیح آبادی۔ (۵) حفیظ جالندھری۔ (۶) تلوک چند محروم (۷) اقبال میرٹھی۔ (۸) انند نرائن ملا۔ (۹) روش صدیقی۔ ان میں سے تین کی بابت فرمایا ہے کہ بھول کر بھی غزل کی طرف متوجہ نہ ہوئے یا ہوئے تھے، یہ محروم، جوش اور احسان دانش ہیں۔ محروم کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ آواز بلند اور کسی حد تک کرخت ہے، نرمی اور لوچ کی نمایاں کمی ہے، شیرینی کا نام و نشان بھی نہیں، شاعر نہیں، نغمہ ہیں، ثبوت میں یہ شعر پیش کئے ہیں:۔

اے ہمرہان دشت محبت بڑھے چلو — اپنا تو پائے شوق سلاسل میں رہ گیا

اے دل یہ کیا فسردگی آغاز عشق میں — گل کیوں ترا چراغ سر شام ہو گیا

ہو دور غم کہ عہد خوشی دونوں ایک ہیں — دونوں گزشتنی ہیں۔ خزاں کیا۔ بہار کیا

سمجھ میں آیا نہ راز صنعت ذرا بھی صوت گر ازل کا — بنا رہا ہے مٹا مٹا کر، مٹا رہا ہے بنا بنا کر

فرماتے ہیں کہ پہلے شعر میں ہمرہان دشت محبت سے مخاطبت ہے تو دوسرے شعر میں اپنے دل سے تخاطب ہے۔ بقیہ دو شعر میں بظاہر کسی سے مخاطبت نہیں لیکن لیجئے کہ یہ ہے کہ شاعر خلوت خیال میں دل کا ترجمان نہیں بلکہ کسی بزم میں خطیبانہ انداز میں مائل گفتگو ہے۔ سمجھے آپ شاعری میں، خطابت کا مفہوم؟ یہ منطقی استدلال، باند آہنگ لفظی خشک پند و موعظت نہیں ہے بلکہ جہاں حرف ندا آیا شاعر خطیب بن گیا۔ یہی نہیں بلکہ حرف ندا بغیر بھی مخاطبت نظر آتی ہے۔ واضح ہو کہ لفظ مخاطبت استعمال ہوا ہے نہ کہ خطابت

جس سے غیر شاعرانہ انداز بیان اور لہجہ کی طرف اشارہ ہو۔ آیئے پہلے شعر کو اُس اُصول پر جانچیں جو میں نے عرض کیا ہے:۔

۱۔ کیا کہا۔ ۲۔ کن الفاظ میں کہا۔ ۳۔ جو کچھ کہا اُس کی قدر و قیمت کیا ہے۔

۱۔ ایک شخص بر بنائے اسیری یا دیگر قیود و موانع منزل کی طرف گامزن ہونے سے باز رہتا ہے، وہ اس حالت میں اپنے ہمراہیوں کو آواز دیتا ہے کہ تم نہ ٹھہرو بلکہ بڑھے چلو۔

۲۔ خیال پورے جوش اور قوت سے نظم ہوا ہے، منزل کے شوق کی طرف "پائے شوق" کا اشارہ لطیف اور بلیغ ہے۔ "بڑھے چلو" سے ہمراہیوں کے توقف اور اس شخص کی مدد کو طیار ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے، اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص اپنے سبب سے دوسروں کی منزل کھوٹی کرانا نہیں چاہتا۔

۳۔ شعر میں حُسن کے ساتھ صداقت ہے۔ ہمت ہار کر بیٹھ جانا معمولی بات تھی مگر شاعر ایک ایسی صورت پیش کرتا ہے جہاں انفرادی شخصیت جمہوریت میں مبدل ہو گئی ہے۔ کچھ پروا نہیں اگر یہ شخص محروم رہا، ہمراہی سرگرم طلب رہیں اور منزل مقصود تک پہونچ جائیں۔ ایسے شخص کا غیور اور "انسا" پر عامل ہونا لازم ہے۔ کردار کا یہ پہلو بخوبی روشن ہے۔ اُس کردار کی شرافت اور عمل پر غور کیجئے جو ہمراہیوں سے حالت ابتلا میں مدد کا خواستگار ہوا تو کیسا متوقع بھی نہ ہو بلکہ تاکید کرے کہ بڑھے چلو مجھ پر جو گزرتی ہے گزرنے دو۔

میں نے ایک نمونہ پیش کر دیا، آئندہ مطالب کی وضاحت نہ کروں گا ورنہ یہ مضمون کبھی ختم نہ ہوگا۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ محروم کے کلام میں ایک صاحب بصیرت کی حقیقت نگاری تو ہے مگر وہ عناصر کم ہیں جو غزل کو رنگین بناتے اور مزا بھرتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر مجھے بہت پسند آیا:۔

بیدار کے لئے نہیں ممکن اگرچہ خواب — جو کچھ ہے خواب ہے دل بیدار کے لئے

جوش کے متعلق پروفیسر صاحب کی رائے ہے کہ سیماب کی طرح غزل میں نئی وسعتیں پیدا کرنے کی کوششیں کیں، اس طرح ایک حد تک تاریخی اہمیت ہے لیکن غزل میں کوئی خاص پایہ نہیں۔ بلند آہنگی کے ساتھ ترکیبیں اور بندشیں رعب دار ہوتی ہیں جن سے غزل کا بڑے قصیدہ کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔

جوش کا شاعرانہ اقتدار مسلم، وہ اُن معدودے چند شاعروں میں ہیں جو تخیل کی بلند ترین پرواز کے باوصف اپنے اشعار کو مغلق اور مبہم نہیں ہونے دیتے اور زبان کے اصولی حدود سے انحراف نہیں کرتے، قدرت کی طرف سے اُنھیں یہ سلیقہ بھی ودیعت ہوا ہے کہ خیال اور اظہار خیال کے اسالیب میں توازن کے ساتھ رنگینی، رعنائی اور دلکشی بھی پیدا کریں۔ فن کی تکمیل میں تازگی اور ندرت بھی ہوتی ہے، زندگی کا درد و جزر بھی پایا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ہے مگر جب سے شاعر کو "ایڈیٹر، مفکر اور مصلح" بننے کا شوق چرایا جس کے تحت الشعور اُن کی "مفروضہ" تمناؤں اور خواہشوں کی ناکامی کا احساس کارفرما ہے، اور جس نے اُنھیں ایسا بچہ بنا دیا ہے جسے ماں نے خراب کیا ہو اُن کی شاعری میں عذوبت کی بجائے تلخی، درشتی اور خشونت نے لے لی ہے۔ اُن کی شاعری کی ابتدا غزل سے ہوئی، تھوڑے ہی عرصہ میں دھوم مچ گئی نظم کی طرف متوجہ ہوئے، وہاں بھی کوس لمن الملک بجایا۔ کس قدر قابل عبرت ہے یہ امر کہ اب وہی جوش "اہرمن زار الحاد" میں ڈانٹے کی "ڈیوائن کامیڈی" کے "نیم اڈ" کی طرح حلق سے آوازیں نکال رہے ہیں! اگر ماضی کی طرح مستقبل بھی "مغنیٔ آتش نفس" کے سر پر بقا کا تاج رکھے گا تو اُن کی ایسی شاعری دیرپا نہیں معلوم ہوتی۔ یہ نغمہ نہیں ایک چیخ ہے اور چیخ بھی ایسی جو دکھے دل سے نہ نکلی ہو بلکہ بیکسی و عسرت کے اچانک سوئی چبھو دیجائے۔ افسوس اُردو ایک ایسے شاعر سے محروم ہو گئی جس میں حافظ شیراز کے امکانات تھے۔ جو شخص اس پایہ کے شعر کہہ سکتا ہو اگر غزل سے باغی نہ ہو جاتا تو نہ معلوم کہاں ہوتا:۔

میں آہ نہ بھرتا تو ترا لعل نگاریں — گل بیز و گل افشاں و گہربار نہ ہوتا
کچھ روز تک تو نازشِ فرزانگی رہی — آخر ہجوم عقل نے دیوانہ کر دیا
فراغ روز مسرت کے ڈھونڈنے والے — شبوں کو محرم سوز و گداز کرتا جا
آیا ہے جوشؔ تحفۂ داغ جگر لئے — مرضی تری، پسند نہ کر یا پسند کر
اتنا مانوس ہوں فطرت سے، کلی جب چٹکی — جھک کے میں نے یہ کہا "مجھ سے کچھ ارشاد کیا؟"
مجھ کو تو ہوش نہیں، تم کو خبر ہو شاید — لوگ کہتے ہیں کہ تم نے مجھے برباد کیا
مٹ چلی تھی خلش سجدۂ شوق — پھر ترا نقشِ قدم یاد آیا

پروفیسر صاحب احسان دانش کے بارے میں کہتے ہیں کہ غزلیں کہکر غزل پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ نظم گو ہیں اور غزل کہتے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ مجھے امید ہے کہ اگر اس طرف توجہ رہی تو نظم کی طرح غزل میں کامیاب ثابت ہوں گے۔ جس شخص میں ایسے شعر کہنے کی صلاحیت ہو اُس سے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔

میں اُس کی شانِ کرم کے صدقے، دیا ہے احسان مجھ کو کیا کیا
خموشیوں کی فغاں پیہم، سکوں کی آہیں، نظر کے نالے

نہ جانے محبت کا انجام کیا ہے
میں اب ہر تسلی سے گھبرا رہا ہوں

ہماری رضا جوئیوں کو دعا دے
ترے ناز کو بے نیازی سکھا دی

عشق کو تقلید سے آزاد کر
دل سے گریہ، آنکھ سے فریاد کر

بھٹکا ہوں اپنی منزلِ مقصد سے بارہا
آسان جان کر، کبھی دشوار دیکھ کر

علی اختر، اختر شیرانی، روش صدیقی اور افسر میرٹھی کے کلام میں پروفیسر صاحب کو ایک قسم کی تازگی، جوانی کی اُمنگ، زبان میں سبکی اور نرمی ملتی ہے، لیکن افسر کے سوا کسی کا ایک مخصوص رنگ نہیں۔ اختر شیرانی کی بعض نظمیں مجھے بہت پسند ہیں۔ اُن کے کلام میں جوش اور تازگی کے ساتھ ایک خلوص ایسا ہے جو بہت سی بے عنوانیوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ اکثر شبہ ہوتا ہے کہ ظاہری شگفتگی ایک مایوس و حرماں نصیب کا اپنی بربادیوں پر قہقہہ ہے جو فریاد سے کہیں زیادہ دلخراش ہے۔

ہوئے ناکام، ہوس کار بنے کیوں اختر
یادِ سلمیٰ میں جوانی کو گنوا دینا تھا

خواب نوشیں میں ہے وہ جانِ بہار
نور و نکہت کی داستان خموش

اس ادا سے کون یہ جلوہ گر سرِ بزمِ حسن خیال ہے
جو نفس ہے مست بہار ہے، جو نظر ہے غرقِ جمال ہے

علی اختر کے خیالات کو بھی پروفیسر صاحب نے نوخیز اور خام کہا ہے حالانکہ اُن کے کلام میں کافی گہرائی ہے:۔

دل کے افسانہ ہائے جمیل
آنسوؤں میں سنائے جاتے ہیں

توڑ دے دل میں کوئی تیز سا نشترِ مطرب
روح خوابیدہ ہے، نغموں کا یہ ہنگام نہیں

مسکرائے وہ، مجھے یاد آگیا پیمانِ ضبط
رہ گئی شرما کے گستاخی لبِ فریاد کی

مبارک ہیں اُس دل کی بربادیاں
جو تیرے تصور سے آباد ہے

میری نگاہِ شوق کو یہ کس نے بخشدیں
حیرانیاں، لطافتِ عرفاں لئے ہوئے

کروٹیں لیتی ہے پھولوں میں شراب
ہم سے اس فصل میں توبہ ہوگی؟!

بن سکا درمان محرومی نہ اُنکا التفات
تھم گئے آنسو، مگر آنکھوں کو ویراں کر گئے

جب میں نے سنا ہے نام اُنکا
دل پر اک چوٹ سی لگی ہے

روش صدیقی کی غزل کو بھی پروفیسر صاحب علمی اور بے اثر کہتے ہیں حالانکہ نظم کی طرح اُن کی غزل بھی ایک خوددار اور پر صفا شخصیت کی آئینہ دار ہے جس کی فتادگی اور شکست میں بھی اک شان ہے:۔

یا تقاضائے محبت محال سمجھونگا
اگر یہ سچ ہے کہ ملنا ترا محال نہیں

خموشی سے بھی بار ترجمانی اُٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک روداد محبت ہوتی جاتی ہے

ہونے ہی کو ہے ایدل تکمیل محبت کی
احساس محبت بھی مٹتا نظر آتا ہے

مدتوں سے ہے کسی عالم خاموش میں عشق
گریۂ نیم شبی ہے نہ ترانۂ سحری

افسر میرٹھی کے ساتھ بھی پروفیسر صاحب نے انصاف نہیں کیا۔ افسر میرے متاثر ہیں اور اپنے اشعار میں وہی سادگی پیدا کرنے اور تاثیر بھرنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے کلام میں جدید اثرات بھی پائے جاتے ہیں:۔

وہ دولت جس کا دنیا نے مسرت نام رکھا ہے
ترے جلوؤں کی دامانِ نظر میں بھیک ہوتی ہے

مصلحت کا ہے تقاضا احتیاط
دل یہ کہتا ہے کہ دیکھا کیجئے

ہر خزاں کے غبار میں ہم نے
کاروانِ بہار دیکھا ہے

تاروں کا گو شمار میں آنا محال ہے — لیکن کسی کو نیند نہ آئے تو کیا کرے
مجھے فردا کی فکر کیونکر ہو — غم امروز کھائے جاتا ہے

پروفیسر صاحب کی نظر میں حفیظ جالندھری کے خیالات متبذل اور پیش پا افتادہ ہیں جن میں کوئی حُسن، جدت یا انوکھا پن نہیں، حالانکہ اُن کے اشعار میں بچتگی کے ساتھ تازگی ہے اور اُن شاعروں میں ہیں جو "راز درون خانہ" پردہائے می و مینا میں بیان کرنے کی قدرت رکھتے ہیں:-

ہر قدم جس کو نئی چال نہ چلنی آئے — وہ تو رہزن بھی نہیں، راہنما کیا ہوگا
خلاف تقدیر کر رہا ہوں، پھر ایک تقصیر کر رہا ہوں — پھر ایک تدبیر کر رہا ہوں، خدا اگر کامیاب کر دے
بے تعلق زندگی اچھی نہیں — زندگی کیا موت بھی اچھی نہیں
فغاں کے واسطے ذوق سلیم ہے درکار — یہ جس کے پاس نہ ہو، صبر اختیار کرے
ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات، یاد نہ تم کو آسکے — تمنے ہمیں بھلا دیا، ہم نہ تمھیں بھلا سکے
آنے والے کسی طوفان کا رونا رو کر — ناخدا نے مجھے ساحل پہ ڈبونا چاہا

انند نرائن ملا کی نسبت فرماتے ہیں کہ ابتذال و فرسودگی سے پرہیز ہے لیکن جدت و باریکی کا نام و نشان نہیں - وہ عجیب "معلق" کلام ہوگا جس میں یہ بھی نہ ہو اور وہ بھی نہ ہو۔ پروفیسر صاحب نے ملا کو نصیحت فرمائی ہے کہ محض خیال بندی سے کام نہ لیں اور اپنے ذاتی کوائف کی تصویر کشی کریں تو اُن کے شعروں میں جان آجائے۔ میرا مطالعہ کہتا ہے کہ ملا کے پہلو میں ایک درد مند دل ہے اور وہی کہتے ہیں جو کچھ حقیقت و صداقت سمجھتے ہیں۔ ملا کے یہاں انفرادی شان پائی تو پروفیسر صاحب نے حکم لگا دیا کہ شعوری طور پر پیدا کی گئی ہے، فطری نہیں! ایک جگہ فرماتے ہیں کہ تجربات ذاتی نہیں تھے تو اُنھیں حاصل کرتے، تحریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ ملا کے کلام میں جن تجربات کا بیان ہے وہ نہ تو ذاتی ہیں نہ اکتسابی ہیں، یعنی تجربات ہیں مگر نہیں ہیں! - ستم ہے کہ ملا کے یہ لعل پارے حقارت سے ٹھکرا دئے جائیں!

آنکھوں میں کچھ نمی سی ہے ماضی کی یادگار — گزرا تھا اس مقام سے اک کارواں کبھی
ہاں یاد ہے کسی کی وہ پہلی نگاہِ لطف — پھر خوں کو یوں رگوں میں نہ دیکھا رواں کبھی

ملا کی شاعری اُن کی حیات سے بالکل مطابق اور اُن کی بلند نظری کا آئینہ ہے، اس میں جوانی کی ہمت اور ہمت کی جوانی ہے۔ موجودہ معاشی، اقتصادی اور سیاسی نظام سے بے اطمینانی کی بھی جھلک ہے -

ہر شورش حیات سے بدظن بنا دیا — دُنیا کو اہل امن نے مدفن بنا دیا
مہر وہ ہے خاک کے ذرے جو کر دے زرنگار — اونچی اونچی چوٹیوں پر نور برسانے سے کیا
عرش بریں پہ چمکا، آج اور اک ستارہ — کس نے خلوص دل سے سر رکھدیا زمیں پر
پیہم رہ طلب میں مشکل کا سامنا ہے — ہر گام پر فریب منزل کا سامنا ہے
بسنے دو نشیمن کو اپنے، پھر ہم بھی کریں گے سیر چمن — جب تک کہ نشیمن اُجڑا ہے، پھولوں کا نظارا کون کرے
اُسی کو جس نے نہ کی بھول کر بھی بات کبھی — بغیر یاد کے کٹ سکی نہ رات کبھی،

(دوسرے گروپ میں پروفیسر صاحب نے یہ شاعر رکھے ہیں:- (۱) کیفی - (۲) ناطق گلاوٹھی - (۳) امید امیٹھوی - (۴) دل شاہجہاں پوری (۵) آسی - (۶) تاجور - (۷) بیخود (۸) ساغر - (۹) سیماب - (۱۰) وحشت - (۱۱) یگانہ - فرمایا ہے کہ یہ کامیابی سے قافیہ پیمائی کر سکتے ہیں مگر ان میں یہ جوہر نہیں کہ غالب و ذوق و مومن کی طرح اپنی اپنی مخصوص جگہیں ایوان تغزل میں بنالیں طرز بیان خشک، سادہ، بے رنگ کسی انفرادی مطالعہ کا ثبوت نہیں دیتے - اُمید در اصل فارسی کے شاعر ہیں، اُردو میں محض بیاس خاطر احباب کبھی کبھی موزوں کرتے ہیں، فارسی تراکیب کے دلدادہ ہیں۔ میں نے خود اُن سے اکثر اشعار ایسے سنے ہیں جو اُن کے انتخاب سے بہتر تھے، پھر بھی انتخاب کے بعض اشعار میں تاثیر اور مزہ ہے، مثلاً:-

کل تک جو پوچھتا تو اک بات بھی تھی ظالم — اب کس کو پوچھتا ہے، امید اب کہاں ہے

سمجھے نہ تھے کہ ایک دن ایسا بھی آئیگا — ہنسنے پر اپنے آپ ہی رویا کریں گے ہم
دل کی اُلجھن نہ پوچھئے اُمید — ہم نہ خلوت کے ہیں نہ محفل کے
کچھ ابکے عجب حسرتِ دیدار ہے ورنہ — کیا گل نہیں دیکھے کہ گلستاں نہیں دیکھا

ساحر کے متعلق کہنا کہ اُن کا کوئی خاص رنگ نہیں زیادتی ہے۔ انھوں نے تصوف کو اپنالیا ہے اور اس رنگ میں خوب خوب شعر کہے ہیں۔ اُنکی زندگی ہی ایک صوفی کی پاک و بے لوث زندگی ہے:۔

خود رفتگی سے منزلِ حیرت میں ہے مقام — آئینہ خانہ ہے در و دیوار آج کل

اسی پایہ کے اور شعر بھی ہیں، بخوف طوالت نقل نہیں کئے جاتے۔

پروفیسر صاحب نے اُمید اور ساحر سے کچھ زیادہ کامیاب کیفی، ناطق گلاؤٹھی، دل شاہجہاں پوری، آسی الدنی اور بیخود دہلوی کو کہا ہے — مگر پھر کچھ نہیں، یہ عجیب و غریب تنقید ہے! ان سب شاعروں کے انتخاب میں ایک معقول تعداد اچھے شعروں کی ہے جن سے اہل ذوق لذت اندوز ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب بھول جاتے ہیں کہ ان سب حضرات کے ذہن میں غزل کا ایک خاص تصور تھا اور اُسی کے تابع غزل کہی۔ مضامین میں تنوع نہ سہی انداز بیان میں تازگی ہر جگہ نمایاں ہے۔ اکثر اشعار میں حقایق اس طرح نظم ہوئے ہیں کہ نئے معلوم ہوتے ہیں۔ وحشت اور یگانہ خاص شہرت کے مالک ہیں۔ وحشت میں غالب کی تمام خوبیاں جمع ہوگئی ہیں جن پر اُن کی طبیعت نے اضافہ بھی کیا ہے اور اُس رنگ کو نکھارا ہے، محض دلکش ترکیبیں ہی نہیں مضامین بھی بلند ہیں اور طرز ادا میں جدت و شگفتگی و بے ساختگی ہے:۔

ہوئی جو چشم ہوس کامیاب نظارہ — کرم ہے یہ بھی ترے شوق خود نمائی کا
بہار گلشن امید کا مآل نہ پوچھ — وہ خواب رونق گلدستۂ خیال ہوا
معاذ اللہ اتنی نامرادی — کہے گی وہ نگاہ آشنا کیا
مجال ترک محبت نہ ایکبار ہوئی — خیال ترک محبت تو بار بار آیا

اگر وحشت غالب کی یاد تازہ کرتے ہیں تو یاد تازہ کرتے ہیں تو یگانہ میں آتش کا والہانہ انداز، استغنا اور تیکھا پن ہے:۔

خوشی میں اپنے قدم چوم لوں تو زیبا ہے — وہ لغزشوں پہ مری مسکرائے ہیں کیا کیا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروان نفس — عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
خوشا نصیب جسے فیض عشق شور انگیز — بقدر ظرف ملا، ظرف سے سوا نہ ملا
گردن ہی اپنی جب کسی قابل نہ ہوگی یاس — پھر کیا بڑھے گا دل رسن و دار دیکھ کر
نگاہ شوق سے کیا کیا گلوں کا دل دھڑکتا ہے — مبادا رنگ و بو اُڑ جائے پامال نظر ہو کر

یگانہ کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ اُنھوں نے عامیانہ بول چال اور محاوروں کو لکھنؤ کی ٹکسالی زبان سمجھ لیا ہے، اُن کی جدید غزلوں میں یہ رنگ بہت نمایاں ہے

اس گروپ کے شاعروں میں پروفیسر صاحب نے سیماب کو تک بندوں میں غنیمت سمجھا ہے۔ خوش فہمی کا یہ عالم ہے کہ اپنے دعوے کے ثبوت میں (یعنی سیماب نے جدید تغزل کی داغ بیل ڈالی) وہ شعر پیش کئے ہیں جن کی فرسودہ خیالی آپ اپنی ماتمگسار ہے۔

دینا تجھے فریب نوید حیات تم — جب لوگ جا رہے ہوں جنازہ لئے ہوئے
تو اپنی بزم ناز کو دیکھ اور ازل کو دیکھ — آیا کہاں سے تیری تمنا لئے ہوئے

("عدم سے جانب ہستی تلاشِ یار میں آئے")

اس خاکدان عشق کی پہنائیاں نہ پوچھ — ذرے پڑے ہیں وسعت صحرا لئے ہوئے

وغیرہ وغیرہ۔ ایک شعر بھی ایسا نہیں جس میں لطافت یا تازگی ہو۔ یہ شعر دعوت فکر دیتا ہے مگر مطلب سمجھ میں نہیں آتا ؎

تھی کثرت جمال سے تاریک بزم دہر — آنا پڑا چراغ تمنا لئے ہوئے

کثرت جمال سے بزم دہر کا تاریک ہونا اور چراغ تمنا سے جگمگا اُٹھنا میرے ذہن کی رسائی سے بالا ہے۔ میں نے عجیب بات یہ دیکھی کہ پروفیسر صاحب کے بہترین شعر

پسند نہیں آتے اور پست و مبتذل اشعار اُن کے دامن دل کو کھینچتے ہیں۔ اب میں کچھ شعر سیماب صاحب کے انتخاب سے پیش کرتا ہوں جو دراصل تحسین کے مستحق ہیں :-

اے غمِ عشق ترے ظرف میں کچھ آگ بھی ہے
آنسوؤں سے تو علاج تپشِ دل نہ ہوا

ایوان تصور سے اپنے نکلا نہ طلب کی دنیا میں
جب تک ہر ذرے کو میں نے پھیلا کر دنیا کر نہ دیا

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگِ جاں پر

تو انتظار میں اپنے یہ میرا حال تو دیکھ
کہ اپنی حد نظر تک تڑپ رہا ہوں میں

اُس مرکز جمال پر اب ہے مری نگاہ
جلوے بھی دیکھ لیں تو طواف نظر کریں

چمن کے سانحے کو مدتیں گزریں مگر اب بھی
چمکتی ہے جو بجلی، آشیاں معلوم ہوتی ہے

تیسرے گروپ میں یہ شاعر ہیں :- (۱) نوح ناروی۔ (۲) ثاقب لکھنوی۔ (۳) ناطق لکھنوی۔ (۴) اثر لکھنوی (یعنی راقم الحروف) اور (۵) آزاد انصاری۔ یہ گروپ سب سے گھٹیا ہے کیونکہ معنی آفرینی اور نازکخیالی سے کوئی واسطہ نہیں، ساری توجہ الفاظ سے وابستہ ہے، لفظی اُلٹ پھیر کو شاعری سمجھتے ہیں، معنی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں عمیق خیالات پرجوش جذبات، لطیف و باریک و زندہ احساس عنقا ہیں۔ گروپ نمبر ۲ معانی کا گرویدہ تھا وہ بھی نالائق ثابت ہوا تو اُن بیچاروں کا کیا ذکر جو لفظوں کا گھروندا طیار کرتے ہیں ان میں ناطق اور ثاقب مفصل ذکر کے بھی مستحق نہیں وہ نرے کھرے قافیہ پیما ہیں، اثر کے یہاں لطف زبان ہے مگر قدیم رنگِ تغزل سے سرمو تجاوز نہیں کرتے، وہی پرانا دُکھڑا، نوح ناروی اور آزاد انصاری بھی الفاظ سے کھیلتے ہیں اور اسی کھیل کو شاعری سمجھتے ہیں۔ اس گروپ کے شاعر لفظی بازیگر ہیں، لفظوں کی مدد سے حیرت انگیز کرشمے دکھاتے ہیں جن سے ظاہر بیں نظر فریب میں آجاتی ہے اور ان بازیگروں کی چابکدستی سے مرعوب و متحیر ہو جاتی ہے، لیکن ذرا غور سے دیکھنے سے اس چابکدستی کا بھید کھل جاتا ہے۔

یہ ہے پروفیسر صاحب کی رائے کا خلاصہ — جہاں تک میرا تعلق ہے سرِ تسلیم خم کرتا ہوں کیونکہ میں خود ہی کہہ چکا ہوں :-

کیا شخص اثر بھی تھا، سمجھا نہ کوئی اب تک
عاشق تھا کہ شاعر تھا، دیوانہ کہ دانا تھا

لیکن اس گروپ کے دوسرے شاعروں کو بازیگر کہنا "بازی، بازی، باریش بابا ہم بازی!" کا مصداق ہے۔ اللہ اللہ جو لوگ ایسے شعر کہیں وہ بازیگر کہلائیں!

ثاقب لکھنوی :-

بڑے شوق سے سُن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

باغباں نے آگ دی جب آشیانے کو مرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے

ہے روشنی قفس میں مگر سوجھتا نہیں
ابرِ سیاہ جانبِ گلزار دیکھ کر

وہ کیا سمجھ سکیں گے نشیب و فراز دہر
جو چل رہے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

کہنے کو مشت پر کی اسیری تو تھی، مگر
خاموش ہو گیا ہے چمن بولتا ہوا

گلشن میں کہیں بوئے دمساز نہیں آتی
اللہ رے سناٹا، آواز نہیں آتی

دعائیں دیں مرے بعد آنے والے میری وحشت کو
بہت کانٹے نکل آئے مرے ہمراہ منزل سے

ناطق لکھنوی :-

محبت ایک مدت سے ہے، یہ معلوم ہوتا ہے
تمھیں ہر چند پہلی بار دیکھا ہے ابھی میں نے

لہراتی ہے اک بجلی سینے کے حجابوں پر
جنبش میں حرم کا جب پردا نظر آتا ہے

اے شمع تجھ پہ رات یہ بھاری ہے جس طرح
میں نے تمام عمر گزاری ہے اس طرح

چھپ کر ہوا کے جھونکوں میں آتی ہیں بجلیاں
ناطق چمن یہ رہنے کے قابل نہیں رہا

وہ نازک وقت آیا آخر کار
کہ ہر رنگ اب طبیعت پر گراں ہے

دفعتہً اُس کی نگاہ التفات
عشق میں سب سے بڑی اُفتاد ہے

جواب صاف سنکر پا گیا سب کچھ فقیر اُن کا
صدا دینے سے مطلب تھا فقط آواز سُن لینا

بڑھی تقدیر کی وسعت حباب سے آگے
مگر دیکھا تو گویا اک جھلک سمندر کی

آزاد انصاری :-

یوں یاد آؤ گے ہمیں اصلا خبر نہ تھی
یوں بھول جاؤ گے ہمیں وہم و گمان تھا

خدا کے واسطے آ، اور اُس سے پہلے آ
کہ یاس چارۂ تکلیف انتظار کرے

منزل کی جستجو سے پہلے کسے خبر تھی
رستوں کے بیچ ہوں گے اور رہنما نہ ہوگا

دیدار کی طلب کے طریقوں سے بے خبر
دیدار کی طلب ہے تو پہلے نگاہ مانگ

ناز خودداری غلط ثابت ہوا
عادت تسلیم ڈالی جائیگی

افسوس بے شمار سخنہائے گفتنی
خوف فساد خلق سے ناگفتہ رہ گئے

آ، مگر اس قدر قریب نہ آ
کہ تماشا محال ہو جائے

اگر آزاد سا درویش نظروں میں نہیں جچتا
تو جا اور جا کے اہل اللہ کی پہچان پیدا کر

اگر ان شعروں میں نغز اور نازک معنی خود بخود پیدا ہو گئے (لفظی صناعی کے پروفیسر صاحب خود ہی قایل ہیں) تو ایسی شعبدہ گری اعجاز موسوی سے کم نہیں۔ پروفیسر صاحب قایل نہیں تو نہ ہوں۔ بقول میر :-

نعمت رنگا رنگ حق سے بہرہ بخت سیہ کو نہیں
سانپ رہا گو گنج کے اوپر کھانے کو تو کھائی خاک

چوتھے گروپ میں تین شاعر ہیں (۱) جگر۔ (۲) آرزو۔ (۳) جلیل۔ ان کا شمار علٰحدہ اس لئے کیا ہے کہ کسی حد تک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ امتیازی حیثیت کیا ہے؟ پرانی باتوں کو نئے پیرایہ میں بیان کرتے ہیں! مگر حافظ کا یہ حال ہے کہ آگے چل کر جلیل کے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ قدیم و جدید تغزل کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے، اپنے رنگ سے واسطہ رکھتے ہیں اور یہ رنگ قدیم رنگ تغزل کی یادگار ہے۔ آرزو کے یہاں پروفیسر صاحب کو جگر کی رنگینی و جوش و ولولہ یا جلیل کی تازگی نظر نہیں آتی، درد بھرے مضامین پسند ہیں اور مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے حسرت و فانی سے قریب معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کے مرتبے تک نہیں پہونچتے کیونکہ مضامین میں کیرنگی ہے جس سے طبیعت گھبرانے لگتی ہے اور یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے خیالات کی دنیا نہایت تنگ ہے۔

پروفیسر صاحب کے فرمودات میں اتنی صداقت ضرور ہے کہ اُن شاعروں کا دائرۂ تخیل جو انگریزی زبان سے نابلد ہیں نسبتاً محدود ہے۔ انگریزی سے واقفیت نے شاعری کے لئے (میں غزل کو خارج نہیں کرتا) نئی نئی راہیں کھول دیں، تازہ اسلوب مہیا کئے، تخیل میں وسعت پیدا کی، مناظر فطرت کے مطالعہ و ترجمانی کی رغبت دلائی اور اُن کی مصوری کے شوق کو انگیز کیا، مگر یہاں بھی سلیقے اور صلاحیت کو بہت کچھ دخل ہے ورنہ بھونڈے اور بھدے ترجموں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ حاصل کلام یہ کہ مجموعی حیثیت سے یہ گروپ بھی کسی خاص وقعت کا مستحق نہیں حالانکہ ان میں سے ہر ایک خوش فکر ہے اصل یہ ہے کہ موجودہ دور اُردو شاعری کا عہد زریں ہے۔ اُردو نے کسی زمانے میں ایسے اچھے شاعر اتنی تعداد میں پیدا نہیں کئے۔

اب پانچواں اور آخری گروپ آتا ہے جنھیں پروفیسر صاحب حقیقی معنی میں شاعر سمجھتے ہیں، یہ حسرت، فانی اور فراق ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ انھوں نے غزل کو جو اپنے محاسن کھو چکی تھی اور محض رسمی اور تقلیدی چیز ہو کر رہ گئی تھی فرسودگی، ابتذال اور تقلید سے نجات دلا کر (دے کر" نہیں) اصلیت حقیقت اور تاثیر سے مزین کیا۔ اگر میرا حافظ غلطی نہیں کرتا تو پروفیسر صاحب نے کہیں اور کبھی نہیں کہا کہ اُردو غزل کا کوئی ایسا بھی دور تھا جب وہ تقلید کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نہیں تھی یا سوائے معائب کے اس میں محاسن بھی تھے۔ میں اپنے استفسار کو نگار کے مضمون تک محدود نہیں کرتا بلکہ اپنے اور کسی مضمون میں دکھا دیں جہاں انھوں نے غزل کا اعتراف کیا ہو۔ "گل نغمہ" پر اُن کا لکھا ہوا مقدمہ پیش نظر ہے، اُس میں بھی یہ الفاظ ہیں :-

"اُردو شعرا عشق مجازی سے نابلد اور عشق حقیقی سے بے خبر تھے، پھر شاعری میں اصلیت آئے کہاں سے..... اور ابھی تک اُس کے اُبھرنے کا سامان نظر نہیں آتا"

جب غزل کبھی تقلید سے آزاد ہی نہیں تھی، اُس میں کوئی محاسن تھے ہی نہیں تو یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اُردو کے نشاۃ ثانیہ کا سہرا ان شعرائے کرام کے سر ہے؟ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ حسرت نے غزل میں ایک انفرادی فضا پیدا کی، یہ اُن کا حُسن ظن ہے، خود حسرت نے مصحفی، مومن، نسیم دہلوی، تسلیم اور نہ معلوم کن کن شاعروں کے اتباع پر ناز کیا ہے۔ میرا ادعا ہے کہ اُردو نے غزل گو شاعروں میں میر اور انشا کے علاوہ کوئی صاحب طرز شاعر پیدا ہی نہیں کیا، غالب بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ میر کے بعد جتنے شاعر ہوئے آپ کوئی شعر جو اُن کے خاص رنگ کا سمجھئے پیش کیجئے، میں میر کے یہاں وہی انداز بیان نکال دوں گا سوائے انشا

کے جس نے اُردو میں "فینسی" یا ہلکے پھلکے دلکش اور رنگین مضامین اور استعاروں کا اضافہ کیا۔ عرصہ ہوا میں نے انشا کی شاعری پر اُردو میں ایک مضمون لکھا تھا اور اُس کا ترجمہ انگریزی میں "ایرین پاتھ" بمبئی کے غالباً جولائی سنہ ۴۰ء کے نمبر میں شایع ہوا تھا، جنوری و فروری سنہ ۴۱ء کے نگار میں "نقاد صاحب" نے میرے اس قول کو بغیر کسی حوالے کے بڑی ڈھٹائی اور بے تکلفی سے غصب کر لیا۔ مجھے پروا نہ ہوتی اور اس امر کا اظہار بھی نہ کرتا اگر اندیشہ نہ ہوتا کہ ناواقف حضرات اُلٹے مجھی کو چوری کا الزام نہ لگائیں۔ خیر اس قضیہ کو چھوڑئے۔ حسرت کے اچھے اور بہت اچھے شاعر ہونے میں کوئی شک نہیں مگر یہ کہنا کہ وہ کسی خاص طرز کے موجد ہیں غلط اور یکسر غلط۔ اُن کی شاعری پرانے اساتذہ کی آواز بازگشت ہے، فرق صرف لب و لہجہ کا ہے جس کا سبب وہ بُعد ہے جو ان میں اور گزرے ہوؤں کے زمانے میں ہے۔ یہ حسرت یا کسی دوسرے شاعر کی منقصت نہیں۔ حقیقت ہمیشہ ایک ہے اُس کے بیان میں اگر صداقت برتی گئی ہے اور وہ صداقت شاعر کے حسیات میں رچی ہوئی ہے تو اسلوب ادا میں تازگی اور لذت ضرور ہوگی۔ تازگی اس وجہ سے کہ شاعر کے جذبات نے اُس پر عمل کیا ہے، لذت اس وجہ سے کہ حقیقت اور ایسی حقیقت ہے جو دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر نکلی ہے۔ لیکن اس کی پہچان ذوق سلیم پر منحصر ہے اور بہت کم ایسے لوگ ہیں جنھیں اس نعمت سے بہرہ ہے۔ اس باب میں پروفیسر صاحب کا ہمنوا ہوں کہ اچھے بُرے اشعار کی تمیز حساس طبیعت اور باریک بین نظر ہی کر سکتی ہے۔ حسن و صداقت کے ساتھ حقیقت کا اظہار آسان کام نہیں۔ یہی سبب ہے کہ ابتدائے شعر گوئی سے آجتک ہر شاعر کے کلام میں جہاں خوبیاں ہوتی ہیں خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ بقول ایک نقاد کے ہومر بھی کبھی کبھی اونگھ جاتا ہے۔ شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لئے "خذ ما صفا دع ما کدر" پر کاربند ہونا چاہئے، تاہم ناقد کے لئے اچھائیوں اور برائیوں دونوں کا احصا لازم ہے، جو عیب نہیں دیکھ سکتا وہ خوبی کی بھی قدر نہیں کر سکتا۔ نقاد کو شاعر کی شخصیت سے مرعوب یا تعلقات کی بنا پر طرفدارانہ ہونا چاہئے۔ حسرت کے تبذل اور سوقیانہ اشعار کی یہ توجیہ کہ اُن کی وسعت مذاق، خلوص نیت اور فراخدلی کا نتیجہ ہے عذر گناہ بدتر از گناہ کا مرادف ہے۔ اگر ایسے غیر شائستہ خیالات اُن کے دل میں نہیں تھے تو شعر کی صورت کیونکر اختیار کی۔ میر پر قدرت کی تنقید کہ "بلند بس بسیار بلند و پستش بغایت پست" حسرت کے کلام پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ حسرت کے انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں:-

ہم نے کس دن ترے کوچے میں گزارا نہ کیا — تو نے اے شوخ مگر کام ہمارا نہ کیا

"کام" کی معنویت پر غور کیجئے اور اُنگلیاں کاٹئے۔ اس سے تو یہ بازاری شعر کہیں زیادہ مہذب ہے:-

تیری گلی کے سو سو پھیرے — تو تو سوتا بڑا ہے بے خبر

ے محفلِ یار کی رہ جائے گی آدھی رونق — ناز کو اُس نے اگر انجمن آرا نہ کیا

گویا ناز کوئی چیز ہے جو تھیلے میں بند الگ رکھی ہوئی ہے۔ "آدھی رونق" کا فقرہ امانت کی "آدھی توقیر" کو آنکھیں دکھا رہا ہے۔

ے پیہم مجھے پیالۂ مے برملا دیا — ساقی نے التفات کا دریا بہا دیا

"برملا" محض مطلع کی خاطر۔ "پیہم" صرف "دریا بہانے" کی غرض سے۔ برملا کی نمایش شعر کو حقیقت سے کوسوں دور کر دیتی ہے، یہ "دکھاوے" کا التفات نہ ساقی کے شایان شان ہے نہ میخوار کے لئے باعث نازش ہے۔ یہی خیال میر کس خوبی سے نظم کر گیا ہے:-

خورشید سا پیالۂ مے بے طلب دیا — پیر مغاں سے رات کرامات ہو گئی

ے بر سرِ ناز وہ از راہ کرم پہونچا تھا — شب عجب لطف کا سامان بہم پہونچا تھا

مصرع اولیٰ کی ردیف کا جواز ممکن ہی نہیں جب تک از راہ کرم کا لفظی ترجمہ "کرم کے راستے" نہ کیجئے۔ کرم کی غرض سے ناز فرمانی کرم افزا ناز دونوں کی توہین ہے۔

ے بچھی ہیں راہ تمنا میں سیکڑوں نگھیں — کہ ناز جلوہ کرے تیری خوشخرامی کا

دوسرے مصرعہ کی تعقید فریاد کر رہی ہے۔ محاورہ آنکھیں بچھانا ہے یہاں "نگہیں" بچھائی جا رہی ہیں اور خدا معلوم سیکڑوں کے اضافہ نے سوائے وزن کی خانہ پری کے کیا خوبی پیدا کی۔

ے ایسے بگڑے کہ پھر جفا بھی نہ کی — دشمنی کا بھی حق ادا نہ ہوا

میر کے اس شعر ے روٹھے جو تھے سو ہم سے روٹھے ہوئے رہے وہ — کیا روئے ہمیں تو منت بھی کر نہ آئی

یا غالب کے اس شعر ے اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا

کے بعد ایسی قافیہ پیمائی کیا ضرور ہے؟

ے بام پر آنے لگے وہ سامنا ہونے لگا — اب تو اظہار محبت برملا ہونے لگا

"زہرِ عشق" کا پیش لفظ لکھ دیا گیا! داغ بیچارہ مفت بدنام ہے:۔

ے داغ میں پرچا ہی لوں گا باتوں باتوں میں اُسے — شرط یہ ہے میرا اُس کا سامنا ہونے لگے

پردہ بھی ہے اور پرچانے کی ابتدا بھی داغ ہی کی طرف سے ہوگی۔ یہاں معشوق بام پر آنے ہی نہیں لگا بلکہ برملا اظہار محبت کرتا ہے۔ یہ شاعری تو ہے نہیں اور جو کچھ ہو:۔

ے گماں نہ ہمپہ ہو زاہد کو ہرزہ کاری کا — کہ ذکر یار میں ہے شغل بیقراری کا

زاہد کی نظر میں سبک ہونے کا اندیشہ۔ اگر ایک طرف اُس کی بے جا خوشامد ہے تو دوسری طرف رندی و پاک مشربی کی تحقیر ہے۔ شعر کو حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔

"مبارک باشد" والی غزل کافی مطعون ہو چکی ہے اُس پر مزید خامہ فرسائی بے کار ہے۔

کچھ کچھ اس راز کی ہم کو بھی خبر ہے حسرت — آپ جاتے ہیں جو روزانہ سرِ شام کہیں

انداز بیان کسی اچھے مفہوم کی رہنمائی کر ہی نہیں سکتا۔

ے وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھ کو — سمجھ لیا ہے جو مجبور آرزو مجھ کو

"دیکھا نہ کر" نظم نہ ہو سکا تو جو چاہا کہہ دیا۔

ے سب کی خاطر کا ہے خیال تمھیں — کچھ ہمارا بھی انتظام کرو

حقانیت پر محمول کر دیجئے ورنہ شعر کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ معشوق سے گھاتا مانگا جاتا ہے۔

مائل شوق مجھے پا کے وہ بولے ہنسکر — دیکھو تم نے جو چھوئے آج ہمارے گیسو

فاتحہ پڑھنے چلے مرقد حسرت پہ جو وہ — پہلے کس ناز سے رو رو کے سنوارے گیسو

پہلی ادا ایک بیوفائی اور دوسری ایک ڈائن کی ہے۔ انھیں داستان حسن و عشق یا لطائف شعر و شاعری سے کوئی نسبت نہیں۔

بہت خجل ہے ترے درد سے دوا میری — یہ خوف ہے کہ نہ سُن لے کہیں خدا میری

نہ جانے حسرت نے "دوا" کہا ہے یا "دعا"، "درد" کے ہوتے دوا ممکن معلوم ہوتا ہے گو معنی کے اعتبار سے دوا کی جگہ قافیہ "دعا" چاہئے۔ خبر دوا رہے یا دعا، یہ بھی ہے خجالت بھی ہے اور یہ خوف بھی ہے کہ خدا نہ سُن لے (یعنی دعا قبول نہ ہو جائے)۔ اسی شعر کا مذاق بلند ہو جاتا اگر یہ خیال نظم ہوتا کہ حصول مدعا کی دعا کرتا ہوں اور پھر ڈرتا ہوں کہ دعا قبول نہ ہو جائے ے کبھی چرا کے جو روزن سے بھی تجھے دیکھوں — تو چور کی جو سزا ہو وہی سزا میری

امانت کے دیوان سے ایک شعر کم ہو گیا — اس سے انیس ہیں یہ دو شعر ہیں:۔

ٹوکا جو بزم غیر سے آتے ہوئے انھیں — کہتے نہ کچھ بنا، وہ قسم کھا کے رہ گئے

دعوت میں تری میں بھی ہوں، معلوم ہے لیکن — کیا غیر کی خاطر سے ہے کیا میرے لئے ہے

ایک کے لئے مُرغ مسلّم ایک کے لئے دھوئی ماش کی دال! (یا چھلکوں بھری؟)

حسرت کے انتخاب میں کل ۱۳۶ شعر ہیں، کچھ کی یہ حالت ہے جو آپ نے دیکھی۔ کچھ ایسے ہیں جن میں ابتذال تو نہیں مگر پھیکے بے مزہ، مشکل سے ۲۰-۲۵ ایسے نکلیں گے جو دل و دماغ کے لئے سامان امتزاز مہیا کریں۔ ان کا نمونہ یہ ہے:۔

دل کچھ اس ڈھب سے لئے اُس نے کہ برسوں کوئی — حال سے اپنے خبردار نہ ہونے پایا،

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم — گھبرا گئے ہیں بیدلی ہمراں سے ہم

لوٹ لے جی بھر کے حسرت لذت آزار عشق — اُس ستمگر کا یہ رنگ آشنائی پھر کہاں

رات دن رہنے لگی اُس ستم ایجاد کی یاد — حسرت اب دیکھئے انجام ہمارا کیا ہو

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد — جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

نہ دیکھے اور دل عشاق پر پھر بھی نظر رکھے — قیامت ہے نگاہِ یار کا حُسنِ خبر داری
گراں گزرے گا حرفِ آرزو اُس طبعِ نازک پر — نگاہِ شوق اس مفہومِ رنگیں کو ادا کر دے
واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب — آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی
اک رنگِ التفات بھی اُس بے رخی میں تھا — اک سادگی بھی اُس نگہِ سحر فن میں تھی
بجا ہیں کوششیں ترکِ محبت کی، مگر حسرت — جو پھر بھی دلنوازی پر وہ چشمِ سحر کار آئی
ہو کے نادم وہ بیٹھے ہیں خاموش — صلح میں شان ہے لڑائی کی

فانی کے انتخاب میں حسرت کے برخلاف ابتذال نہیں ہے مگر متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں منطقی استدلال ہے، جن میں محض الفاظ کی طلسم بندی یا مصنوعی آہ و بکا ہے۔ چند ایسی مثالیں:۔

اب تک تری گلی میں یہ رسوائیاں نہ تھیں — اب تک تو اس زمیں پہ کوئی آسماں نہ تھا
اللہ رے بے نیازیِ آدابِ التفات — دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
ہائے کیا دن ہیں کہ نقشِ سجدہ ہے اور سر نہیں — یاد ہیں وہ دن کہ سر تھا اور دوش تھا
نہ دل کے ظرف کو دیکھو نہ طور کو دیکھو — بلا کی دُھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی
وہ میری لاش پہ تہمت سی کچھ اُٹھا کے چلے — مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے
مطلب ہے ضبطِ عشق سے تاثیرِ دردِ عشق — اخفائے حال سے غرض افشائے حال ہے

فانی کی شاعری ایک ایسے منکر و فلسفی و عاشق کی شاعری ہے جو غم سے نجات حاصل کرنے کو شراب خواری یا دوسرے قبیح افعال اختیار کرنے کے عوض شاعری میں کھو جانا چاہتا ہے اور اس غرض سے شاعری کو اپنا مشغلہ بناتا ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے مسائل اور اُس کی تلخیاں بیان کرنے میں اپنی پوری قوت فکر صرف کرتا اور غم میں لذت محسوس کرنے لگتا ہے۔ جن شعروں میں اُفتادِ طبیعت جلوہ گر ہے لاجواب ہیں، جن میں زندگی اور موت یا دیگر مسائل پر فلسفیانہ تبصرہ ہے وہ کیف اور لذت سے خالی ہیں۔ کچھ اچھے شعر سُن لیجئے:۔

اک معما ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا — زندگی کاہے کو ہے، خواب ہے دیوانے کا
مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اُس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا
میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دُکھا ہوا
سُنکے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
اُس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی — کیا کرو گے وہ اگر یاد آیا
آج تسکین دردِ دل فانی — وہ بھی چاہا کئے مگر نہ ہوئی
زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہئے، مگر — موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے
دشمنِ جاں تھے تو جانِ مدعا کیوں ہو گئے — تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے
جینے بھی نہیں دیتے، مرنے بھی نہیں دیتے — کیا تم نے محبت کی ہر رسم اُٹھا ڈالی
شکوہ نہ کر فغاں کا وہ دن خدا نہ لائے — تیری جفا پہ دل سے جب آہ بھی نہ نکلے
کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر — کچھ امید جواب میں گزری
زندگی بے دلوں پہ تہمت تھی — مر نہ جاتے اگر جئے ہوتے

اب فراق کی شاعری کو لیجئے۔ میں آج تک سمجھتا تھا کہ وہ شاعری نہایت ہی سطحی اور بے جان ہوتی ہے جس میں بظاہر متضاد چیزوں میں مصنوعی اور غیر حقیقی ربط ثابت کرنے کی کوشش ہو۔ اجتماعِ ضدین یا اتحادِ تضاد ایک صنعت ہے شاعری نہیں۔ مجھے سخت حیرت ہوئی کہ فراق صاحب کو اس صنعت کے استعمال پر

نازہے، نیز اکثر ناقدین بھی اس بنا پر اُن کی مدح میں رطب اللسان ہیں ہر چند اُس شاعری کی بے مایگی ظاہر ہے جس کی ساری کائنات اجتماع ضدین ہو۔ یاد رہے فراق صاحب کا یہ مذہب نہیں معلوم ہوتا کہ تضاد اشیا سطحی ہے اور ان کی تہ میں ایک ہی حقیقت کارفرما ہے جس کو برافگندہ نقاب کرنا شاعر کا فرض ہے۔ اس کے برخلاف وہ زندگی اور شاعری دونوں کو تعطل محض یا دماغی ورزش میں منتقص کر دینا چاہتے ہیں کیونکہ فرماتے ہیں:۔ "شاید زندگی کو شعر میں تحلیل کرنا اور شعر کو آئینہ بنانا مقصد زندگی ہے"

"مقصد شاعری" کہتے تو مجھے اختلاف نہ ہوتا۔ مقصد زندگی کہکر اُنھوں نے زندگی اور شاعری دونوں کی حقیقت سے لاعلمی ظاہر کی۔ حقیقی زندگی اُن وقتی واقعات سے بالاتر ہے جو روزمرہ پیش آتے رہتے ہیں ایسے واقعات قلمبند کرنا شاعری سے نہیں بلکہ عمرانیات یا تاریخ سے متعلق ہے۔ فراق صاحب کی شاعری کے مساعی بس اتنے ہیں کہ زندگی کے تلخ واقعات کو خوشگوار کر دکھایا جائے، یہ شاعری نہیں خود فریبی ہے۔ اگر اُنھوں نے شاعرانہ الہام کی روشنی میں زندگی کی حقیقت پر غور کیا ہوتا تو معلوم ہوتا کہ زندگی نام ہے امید و بیم کے کھلونوں کو توڑ کر خود اپنی قدرت سے لذت اندوز ہونے کا، ظاہر و باطن کے امتیاز کو مٹا دینے کا، اس تیقن کا کہ زندگی واحد اور غیر منقسم ہے اور ایک ابدی طاقت اس کا مرکز بھی ہے، قطر بھی ہے اور درمیانی فضا بھی اسی سے معمور ہے۔

ہستی ہے اپنے طور پہ جوں بحر جوش میں — گرداب کیسا، موج کہاں ہے، حباب کیا

(یہ شعر میر کا ہے جسے بے بصیرت قنوطی شاعر کہتے ہیں!) لطف یہ ہے کہ جو لوگ شاعری کو ان رفعتوں پر پہچاننا چاہتے ہیں اُن کی شاعری حقیقت سے دور اور زندگی کی مفسر نہیں سمجھی جاتی اور سمجھی کیونکر جائے جب زندگی کا مقصد نفس پروری اور کثافتوں میں آلودہ رہنا ٹھہرے — ایک ناقد جس چیز کو فراق کی "اُکھڑی اُکھڑی سی منفرد اور دلکش بات" سے تعبیر کرتے ہیں وہ دراصل ترنم کا فقدان ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فراق پہلے کچھ نثر میں تحریر کرتے ہیں پھر اُس کو نظم کا چولا بدلوانا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شعر ایک جامہ زیب معشوق کے بجائے کفن میں لپٹی ہوئی میت معلوم ہوتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ امر واضح ہو جائے گا

تیرے چھونے سے بھی دُکھے جو — کون اُس دل کی پھانس نکالے

جس کے کانوں کو موسیقی سے ذرا بھی لگاؤ ہوگا وہ شعر کاٹ دے گا لیکن لفظ "جو" اُس مقام پر نہ رکھیگا جہاں مصرعہ اولیٰ میں واقع ہے۔ شعر کا سارا طلسم "دل کی پھانس نکالنا" محاورے پر قایم کیا گیا ہے، پھر پھانس جو محض بربنائے محاورہ پھانس (خلش) اور غیر مرئی تھی اصلی پھانس بن گئی جو چبھوئی بھی جا سکتی ہے اور نکالی بھی جا سکتی ہے! ایسے شعروں سے بچے ہی بہل سکتے ہیں — ؎ کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہونچتی ہے کہاں سے کہاں

پہلا مصرعہ ہچکیاں لے رہا ہے۔

؎ پھر دل پہ ہے نگاہ کسی کی رکی رکی — کچھ جیسے کوئی یاد دلاتا ہو آج پھر

"آج پھر" جس طرح واقع ہے فصاحت کا گلا گند چھری سے ریت رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ شاعر کی تخیل شعر کی خلاق نہیں بلکہ اُس کے منہ میں ایک نوالہ ٹھونس دیا گیا ہے جو اُس نے بادل ناخواستہ پیا یا مگر حلق سے نہ اُتر سکا اور گھبرا کر اُگل دیا۔ فراق کے اکثر اشعار ایسے "روایتی بچے" ہیں جن کے خدوخال چاٹ کر پیدا کئے جاتے ہیں۔

میرے لڑکپن تک پہیلیوں اور مکرنیوں کے ساتھ "دو سخنوں" کا عام رواج تھا، انکی بنیاد اس بے جوڑ چیزوں میں وجہ مشترک بیان کرنے پر ہوتی تھی اور اسکا مدار ایک ذو معنیں لفظ پر ہوتا تھا۔ مثلاً:۔ سوال = (۱) گوشت کیوں نہ کھایا (۲) ڈوم کیوں نہ گایا — جواب = گلا نہ تھا — سوال = (۱) انار کیوں نہ چکھا (۲) وزیر کیوں نہ رکھا۔ جواب = دانا نہ تھا

کچھ اسی قسم ربط فراق صاحب کے معیار شاعری و مقصد زندگی کے مابین ہے۔ اُنکی شاعری نفسیاتی گتھیوں کو سلجھاتی تو کیا ہے، البتہ خود ایک نفسیاتی گتھی ہے۔ اُنکے انتخاب میں ایسے شعر بھی ہیں مگر کمتر:۔

اک فسوں ساماں نگاہ آشنا کی دیر تھی — اس بھری دنیا میں ہم تنہا نظر آنے لگے

نگاہ یار کب تک یہ فریب ہمت افزائی — یہیں تک عشق مشکل تھا یہیں سے عشق آساں ہے

ابھی فطرت سے ہونا ہے نمایاں شان انسانی — ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

چل گئی کیا جانے کیسی ہوا — آج بجھے دل سے بھی اُٹھا دھواں

انقلاب آیا تو یوں آیا نگاہ یار میں، — کچھ مروت میں اضافہ کچھ محبت میں کمی

"بی جسے چاہیں وہی سہاگن" ورنہ کہاں حسرت اور فانی اور کہاں فراق۔ کوئی تک ہی نہیں۔ نگار کے باقی تنقید نگار آل احمد سرور، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر اور خود نیاز صاحب ہیں، جو پہلو اتفاق یا اختلاف کے تھے ضمناً اس مضمون میں آگئے۔ فرداً فرداً بحث کرنا تحصیل حاصل ہے۔۔ (خان بہادر) مرزا جعفر علی خاں اثر

# باب المراسلۃ والمناظرہ

## جوشؔ کے خلاف فتوائے دار و رسن

(جناب نسیم بہاری - رکن ادارہ "فطرت" راجگیر)

مکرمی - جوشؔ کی شاعری اور خیالات سے متعلق جناب اصغر سجاد جعفری نے اپنی رائے پیش کی ہے، جو یہاں بڑی مقبول ہوئی۔ آپ کے موقر رسالہ میں بغرض اشاعت بھیج رہا ہوں، امید کہ اپنی رائے کے ساتھ شایع فرما کر شکریہ کا موقعہ دیں گے۔ وہ تحریر یہ ہے :-

## جوشؔ کو سُننے کے بعد

(از اصغر سجاد جعفری)

"جوشؔ کی زبانی اور مستی کی کہانی یہی، کتاب "حرف آخر" ہے جو اندنوں جوشؔ ملیح آبادی لکھ رہے ہیں۔ چند ماہ میں یہ کتاب منظر عام پر آجائے گی "حرف آخر" کو مصنف کی زبان سے سُننے کا موقعہ ملا۔ کتاب چونکہ غیر مطبوعہ ہے اس لئے شاید مجھے اس پر کچھ لکھنا نہیں چاہئے تھا۔ لیکن جن خیالات کے ساتھ یہ کتاب دنیا کے سامنے پیش کی جارہی ہے وہ مذہب اور خدا کی توہین ہے اس لئے اس کے نقایص کا بتا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے شاعر سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ترمیم کرسکے !

جوشؔ کے کلام سے بغاوت کی بو آتی ہے، حکومت ہی کے خلاف نہیں، موجودہ تہذیب ہی کے خلاف نہیں، دور حاضر کے اُصولوں کے ہی خلاف نہیں، بلکہ قسمت کے خلاف، تقدیر کے خلاف اور خود خدا کی خدائی کے خلاف ! اگر حکومت کے خلاف انھوں نے اپنی نظموں میں بغاوت کی تو وہ بغاوت نہیں جنگ آزادی کا نعرہ تھا، اگر موجودہ تہذیب اور موجودہ انسانیت کے خلاف انھوں نے بغاوت کی تو میں کہوں گا وہ صحیح ہیں کیونکہ انسانیت دنیا سے ناپید ہے۔ سچائی انصاف دنیا میں باقی کہاں ہیں ؟ یہاں تک تو میں سمجھتا کہ جوشؔ نے انسان کی پستی کو محسوس کیا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا ہے، مگر جوشؔ صاحب حد سے بڑھ گئے ہیں اور انھوں نے مذہب کی دھجی اُڑانے کی ٹھانی ہے اور خود خدا کے خلاف ہی اعلان جنگ کر دیا ہے، کتاب "حرف آخر" میں جو ادبی کمالات ہیں اس کی بنا پر یہ تو اس قابل ہے "نوبل پرائز" دیا جائے مگر جوشؔ خود اس قابل ہیں کہ "اس شاعر گستاخ کو سولی پر چڑھا دو" ہر پابندی کو توڑ دینا اور ہر اُصول سے بغاوت کرنا یہ جوشؔ کی شاعری ہے۔ انسان لامحدود ضرور ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ ان قیود و بند کو بھی توڑنے کی کوشش کرے جو انسانیت کی تکمیل کے جز ہیں جسم میں روح کا قید ہونا کیا کم پابندی ہے ؟ مگر یہ پابندی توڑی نہیں جا سکتی۔ زہ رہنے کے لئے یہ پابندی ضروری ہے۔ اسی طرح بہت سی ایسی پابندیاں ہیں جنھیں اگر توڑ دیا جائے تو کل یہ بھی پتہ نہیں رہے گا کہ کون کس کا باپ ہے اور کون کس کا بیٹا کون کس کی بہن ہے اور کون کس کی بیوی - اس پابندی سے جانور آزاد ہیں اور دنیا ان کی حالت جانتی ہے دُنیا ایک پابندی ہے اور یہاں رہنے کے لئے کچھ نہ کچھ پابندی ضروری ہو جاتی ہے یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے کپڑے کم سے کم کر دے مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی ننگا ہو کر بازار سے گزر جائے۔ ہوش سے گزر جائے تو شاید کر سکے۔ کپڑا ایک پابندی ہے مگر دور نہیں کیا جا سکتا ! بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاعری ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ شاعری انسانی زندگی کی رہبر ہے، انسانی تہذیب کی جز و اعظم ہے پھر وہ شاعری جو حقیقت سے دور اور ہر پابندی سے آزاد ہو صحیح معنوں میں شاعری ہی نہیں -

جوشؔ صاحب نے "حرف آخر" جا بجا سے سُنایا۔ چنانچہ پڑھتے پڑھتے وہ وہاں پر پہونچے ہیں جہاں خدائے عزوجل ہر شخص کا ضمیر دیکھ رہا ہے۔ جوشؔ صاحب نے ہر شخص کا

ضمیر لکھا ہے، امام مسجد کا ضمیر، ایک خانصاحب کا ضمیر، ایک ہوس پرست کا ضمیر، ایک سود خوار کا ضمیر، ایک ڈاکٹر کا ضمیر، ایک وکیل کا ضمیر، اور دکھایا کہ سب کے سب ہی پستی کے تاریک غار میں گرے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ جوش صاحب کو ایک آدمی بھی نہ ملا جو پاکباز ہو، سچا ہو، خدا کا پرستار ہو، اس زمانہ میں بھی جب دُنیا ایسے لوگوں سے خالی ہے ایک دو تو ضرور ملیں گے اور اگر واقعی انھیں کوئی ملا ہی نہیں تو کم از کم پاکبازی اور سچائی کا ان کے نزدیک ایک معیار تو ہوگا وہ اسی کو پیش کرتے، ضمیروں کی فہرست میں کمی ہے۔ 'غریب کا ضمیر' نہیں لکھا گیا۔ شاعر کا ضمیر' نہ لکھنا جوش کی شکست ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ جو اپنے کو نہیں دیکھ سکتا وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ سکتا اور جوش صاحب دُنیا تو کیا خاک دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہیں دیکھ سکتے تو اپنے کو! یہ افسوسناک ہے!!

کتاب "حرف آخر" اگر دنیا کے سامنے آئی اور مقبول ہو سکی تو مجھے افسوس ہوگا کہ ایک مایۂ ناز شاہکار مقبول نہ ہو سکے اور اگر مقبول ہوئی تو مجھے صدمہ ہوگا کیونکہ یہ کتاب خدا اور مذہب کی توہین ہے۔ اس دن جب جوش صاحب نے بیجا باتیں خدا کی شان میں کہیں اور لوگوں نے سُنی تو میں یہ کیسے امید کروں کہ لوگ اس کتاب کو اچھا نہ سمجھیں گے کوئی دن وہ بھی تھا کہ لوگ جمع ہوتے تھے اس لئے کہ خدا کی تعریف اور حمد کریں، کوئی دن وہ بھی تھا جب لوگ خدا کے اُصولوں کو سینے سے لگائے دنیا کے ہر گوشے میں پھیلایا کرتے تھے وہ زندہ رہتے تھے تو خدا کے لئے اور مرتے تھے تو خدا کے لئے، اور ایک دن آج ہے جب اپنے سے بیخبر لوگ عالم بے خودی میں کیا کیا کہہ جاتے ہیں اور خدا کے بندے حلقہ باندھ کر داد و واہ کرتے ہیں! شاید انسانی پستی کی یہ آخری حد ہے!!

---

(نگار) میں تو خیر نسیم بہاری صاحب اور اصغر سجاد جعفری دونوں سے ناواقف ہی ہوں، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ بھی مجھ سے ناواقف ہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ یہ تحریر میرے پاس نہ بھیجتے اور اگر بھیجتے بھی تو میری رائے چاہنے پر اصرار نہ کرتے۔

میں جوش کی اس نظم کے بعض حصے اُن سے سُن چکا ہوں اور جس وقت میں نے اسے سُنا تو جوش صاحب کو مشورہ دیا کہ اس نظم کے بعد انھیں شاعری ترک کر دینا چاہئے کیونکہ جس رنگ کے وہ شاعر ہیں اس رنگ میں یہ نظم "حرف آخریں" کی حیثیت رکھتی ہے۔

جوش طنز نگار شاعر ہے اور باوجود نامناسب تلخیوں کے بھی اس کا طنزیہ کلام اپنی جگہ ایک خاص مرتبہ ایک مخصوص منزلت رکھتا ہے اور محض اختلاف خیال و عقاید کی مخالفت کی بنا پر اس کے وزن کو کم نہیں کیا جا سکتا۔

یہ بالکل غلط ہے کہ جوش نے اس نظم میں خدا و مذہب کی توہین کی ہے۔ [illegible] تصور کی مخالفت کی ہے جو خدا و مذہب کے متعلق عام طور پر قایم کیا گیا ہے اور اُن لغو روایات کی تضحیک کی ہے جن کو اندھی تقلید کرنے والوں نے "اساسِ مذہب" سمجھ رکھا ہے۔

جوش نے اس نظم میں مذہب کا مفہوم "خالص انسانیت" قرار دے کر، مذہب کے تمام روایتی لٹریچر کو اسی معیار پر جانچا ہے اور ظاہر ہے کہ جو شخص مذہب کا معیار اتنا بلند قایم کرے گا، وہ دُنیا کے موجودہ "پابند رسوم و قیود" مذاہب کو ویسا ہی پائے گا جیسا جوش نے ظاہر کیا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جوش کی یہ نظم واقعی ایک "ملحد و منکر" کی نظم نہیں ہے، کیونکہ خدا و رسول کا انکار کرنے کے بعد بھی وہ اپنے عقاید و رجحانات کی بنا پر دائرۂ "توحید" سے باہر نہیں نکل سکتے اور اگر اس نظم کے وزن کو ہلکا کرنے والی کوئی چیز ہے تو صرف یہی کہ وہ ایک "خالص ملحد و منکر" کی نظم نہیں۔ لیکن اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے مان لیں کہ جوش نے واقعی اس نظم میں خدا و مذہب کی توہین کی ہے، تو بھی اس پر برہم ہونے کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی اور ہمیں کیا حق حاصل ہے کہ ایک شخص کو بجبر مذہب کا پابند بنائیں اور جب وہ اس جبر سے پناہ مانگے تو اس کو "دار و رسن" کا مستحق قرار دیں، جبکہ مذہب کی "دار و رسن" لوگوں کے خیال و زبان کی آزادی کو چھیننے میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہوئی۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس وقت جوش کی یہ نظم شایع ہوگی، مذہب پرستوں میں ایک ہنگامہ بپا ہو جائے گا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ ہنگامہ تو باقی نہ رہے گا اور جوش کی نظم ہمیشہ باقی رہے گی۔

معلوم نہیں جناب نسیم بہاری اور اصغر سجاد جعفری نے دریاباد اور اعظم گڈھ کے خانوادوں کو بھی اس آنے والے فتنہ سے آگاہ کیا ہے یا نہیں۔ اگر نہیں تو اب سہی، کیونکہ اس قسم کی باتیں سمجھنے اور داد دینے والے "روح القدس" وہیں رہتے ہیں۔

---

# مکتوبات نیاز

آپ بھی عجیب چیز ہیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ "ساقی ہے دلربا"، مے کی تندی و تلخی کی شکایت کرتے ہیں۔ میں اگر آپ کی جگہ ہوتا تو [illegible] بند کرکے اپنے آپ کو اس سیلابِ رنگ و بو کے سپرد کر دیتا

میرا ارادہ اخیر [illegible] میں وہاں جانے کا ضرور تھا، لیکن اسی زمانہ میں میرے ایک کرمفرما یہاں آرہے ہیں اور ایک کام سے آرہے ہیں، اس لئے تفریح کا سفر ملتوی۔ وسایل نقل و حرکت باقی رہے تو شاید اپریل کے وسط میں پھر ارادہ کروں گا، مگر غالباً تکمیل کی نیت سے نہیں! — آپ کو کیا معلوم کہ میں نے دنیا کی وسعت کو کتنا تنگ کرلیا ہے! جسوقت مکان کے ایک گوشہ سے چلکر دوسرے گوشہ میں پہونچتا ہوں تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ قطب شمالی سے قطب جنوبی تک کا سفر طے کرلیا! آپ اسے ضعف و کہولت کہیں گے اور میں قناعت! مگر مولویوں اور صوفیوں والی قناعت نہیں جسکے آگے قارون کی حرص و طمع بھی شرماتی ہے، بلکہ ساری دُنیا کو ٹھکرا کر فاقہ کرنے والی قناعت!

آپ کو اپنے علائق کے لحاظ سے بے شک پریشان ہونا چاہیئے، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ بمبارئ لکھنؤ اور بنارس پر تو ہوتی نہیں، رہا بدامنی کا اندیشہ، سو اس کے متعلق سوا اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ جب طوفان سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو طوفان ہی میں اپنے آپ کو ڈالدینا چاہیئے۔

---

کیوں صاحب، یہ تحایف کی تقسیم خویش سے گزر کر درویش تک پہونچی ہی نہیں یا

چوں دورِ خسرو آمد مے درسبو نماندہ

خوش رہیئے، آپ کے یاد نہ کرنے میں بھی لطف ہے

ہاں، جھانسی سے وہ تبدیل ہوگئے ہیں اور ایسی جگہ پہونچے ہیں کہ خضر، شاید چشمۂ حیواں تک تو پہونچ جاتے، لیکن یہاں تک وہ کبھی نہ پہونچ سکتے۔ دس میل فی گھنٹہ چلنے والی ریل سے ۴۸ گھنٹے کا سفر کرکے ایک ایسے اسٹیشن پر اُترئیے، جہاں آپ کو صرف ایک متنفس نظر آئے گا، جو غریب قلی بھی ہے اور بابو بھی! اس کے بعد کہیں بیل گاڑی سے اور کہیں پیادہ پا ۸۰ میل کی وہ منزل طے کیجئے جس میں آپ کو کم از کم پانچ پہاڑ، دس دریا اور بیس صحرا عبور کرنا ہیں —

---

پھر کہیں جاکر آپ یا آپ کی لاش اُن حضرت کے آستانہ تک پہونچ سکے گی!
آپ جاتے ہوں تو جائے، لیکن مجھے بخشیئے ۔ اتنی تکلیف اُٹھا سکتا تو آج حاجی ہوتا!

---

بجا ارشاد ہوا، لیکن مجھے آپ کے استدلال سے اختلاف ہے۔ بیشک پردہ اور اس حد تک پردہ کہ

نقاب عارضِ گل جوشِ می کند ما را

کوئی معقول بات نہیں، لیکن بے پردگی کے جو برکات آپ نے شمار کرائے ہیں اُن سے ضرور مجھے اختلاف ہے۔ ہوسکتا ہے کہ پایانِ کار بے پردگی "رواج معصومیت" میں معاون ہو، لیکن اس کا تعلق ہمارے آپ کے اخلاق کی بلندی سے نہ ہوگا بلکہ صرف اس بات سے کہ دنیا کی ہر وہ چیز جو ہماری دسترس سے قریب ہے، دل سے دور ہے

صحت کا مسئلہ بیشک قابلِ غور ہے، لیکن اس وقت کی بے پردہ ہندوستانی عورت (مغرب کی عورت کا ذکر نہیں کہ وہ تو واقعی مرد بن گئی ہے) شاید ہی کوئی ایسی ہو جس کی صحت پر رشک کیا جائے۔ حوّا نے تو گیہوں کے لئے جنت چھوڑی تھی لیکن حوّا کی یہ بیٹیاں اب نازک بننے کے لئے غذا ہی ترک کر بیٹھی ہیں، وہ نقاہت و نزاکت کو ایک ہی چیز سمجھتی ہیں، ہڈیوں کے ڈھانچہ پر منڈھی ہوئی کھال، سفید دھوئے ہوئے کپڑے کا سا رنگ، دھنسے ہوئے گالوں میں ڈگڈگاتی ہوئی آنکھیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ مومیائی شدہ لاش میں مضمحل سی جان پڑ گئی ہے

چھریرا جسم، کشیدہ قامتی، بیشک رعنائی میں داخل ہے، لیکن ہر ہر پہلو سے نکیلی ہڈیاں چبھو دینے والی عورت تو ایک مستقل خطرہ ہے، رعنائی سے اسے کیا واسطہ!

یہ درست ہے کہ اس کی ظاہری زیبایش و آرایش، جس کو اس نے اسکولوں اور کالجوں میں فن کی حیثیت سے حاصل کیا ہے، اس کے بہت سے نقایص کو چھپا دیتی ہے، لیکن معیاری حُسن تو وہی ہے جو لباس سے جدا ہونے کے بعد اور نمایاں ہو جائے، نہ کہ بالکل ختم!

"جنسیات" سے تعلق رکھنے والی باتوں کو چھوڑ کر آپ "تمدنی" حیثیت سے غور کریں گے تو حالت اور زیادہ افسوسناک نظر آئے گی ۔ خانہ داری، تربیت اولاد، اقتصادی نگہداشت، وغیرہ جن میں دستگاہ رکھنا عورت کا حقیقی حُسن ہے، سو آپ کو اس کا شاید زیادہ دردناک تجربہ ہوگا!

مصیبت یہ ہے کہ ہمارے مذہب کی طرح ہماری ساری معاشرت تقلیدی ہے، عورت کی بے پردگی کا کیا ذکر! ہماری معاشرت کے دوسرے مسایل کی طرح پردہ کے لئے بھی کوئی اُصول موضوعہ مقرر نہیں کیا جا سکتا، زمانہ و ضرورت کے لحاظ سے ہمیشہ اس میں تبدیلی پیدا کرتا ہوگی ـــــ تعلیم بے شک عورت کے لئے ضروری ہے لیکن اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ وہ بے پردہ ہو کر سوسائٹی کا تفریحی عنصر بن جائے

---

پردہ تو اس نسل سے میرے یہاں بھی ختم ہوگیا ہے، لیکن میں نے اپنی لڑکی کو اسکول نہیں بھیجا، گھر ہی میں پڑھکر اسنے فارسی میں دبیر ماہر کی سند حاصل کی، پھر ہائی اسکول کا امتحان بھی اسی طرح دیا اور سال آیندہ الیف۔ اے میں شریک ہو رہی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں "ترقی پسندی" کی نہیں، لیکن اُنیسویں صدی کا انسان بیسویں صدی کی مخلوق سے کچھ تو علحدہ ہی ہونا چاہیئے۔

---

محترمہ - میں اپنی بدنصیبی کا رونا کہاں تک روؤں، ایک وقت تھا

کہ می رفتی و طاقت می رمید از من

یا اب یہ حال ہے کہ آپ سے ملنے کا خیال بھی کوئی مسرت نہیں پیدا کرتا! اس سے زیادہ بدبختی اور کیا ہو سکتی ہے! تاہم آپ کی دلپرسی کا شکریہ ادا کرتا ہوں

یہ آپ نے خوب فرمایا کہ میں دونوں جہاں سے آزاد ہوگیا ہوں - کاشکے ایسا ہی ہوتا - بہرحال خوش ہوں کہ گفتگو میں میری تمنا کی رعایت اب بھی آپ کو ملحوظ ہے - اور ہو سکتا ہے کہ جو بات آپ کہتی ہیں وہ کسی وقت پوری ہو جائے

ایک زمانہ تھا جب ہر وقت یہ فکر رہتی تھی کہ

تسکیں بچہ بخشم دلِ ہنگامہ گزیں را

یا اب یہ حالت ہے کہ ہزار کروٹیں لینے کے بعد بھی دل میں کوئی غیر معمولی دھڑکن پیدا نہیں ہوتی، ہنگامہ کیسا! اس کا علاج اگر آپ کے پاس کوئی ہو تو بتایئے، خالی طنز سے کام نہیں چلتا

اُن کے حال سے بالکل بے خبر ہوں۔ عرصہ ہوا ایک خط علی گڈھ سے آیا تھا، پھر کچھ دنوں کے بعد معلوم ہوا کہ ایک دل اپنے کام کا اُنھیں آخر کار مل ہی گیا - ان کا غیر معمولی سکوت، سکون کی علامت ہے، اس لئے میں بہت خوش ہوں، خدا کرے ان کی "ادبیت" انھیں ایک جگہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دے

---

حضرت - آپ کے خط کا جواب دوں بھی تو بیکار ہے۔ کیونکہ جو خدا کو بے دلیل ماننے والا ہو اس کے سامنے حجت و استدلال پیش کرنا، اب کیا کہوں کہ کیا ہے۔

میں کہوں گا "عقل تو ایسا نہیں کہتی"، آپ فرمائیں گے "عقل کیا چیز ہے"۔ میں عرض کروں گا کہ "اسباب کی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں"، آپ کہیں گے کہ "مشیت ایزدی" میں کس کو مجالِ دم زدن ہے۔

پھر آپ ہی فرمایئے کہ اس "قدرت و مشیت" کا علاج میرے پاس کیا ہو سکتا ہے - آپ نمرود کو اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ اس نے "خلیل اللہ" کو اس میں ڈالکر جلانا چاہا، میں کہتا ہوں کہ "طرحِ گلستاں" "آتشِ نمرود" ہی نے ڈالی

من آتش از دخاں بینم تو از آتش دخاں بینی

آپ کا خدا اور مذہب، دونوں بہت نازک ہیں، اس لئے مجھے خاموش ہی رہنے دیجئے تو بہتر ہے۔

# وقت کی باتیں

## تلک عشرۃ کاملہ

بالشویک نظام حکومت اس وقت جن دماغوں کا رہین منت ہے، ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے۔ اسٹالین کو ملاکر یہ تعداد دس تک پہونچتی ہے:

۱- اسٹالین اسوقت حفاظتِ ملک کی مجلس کا روح رواں ہے اور اپنے چار دوسرے ساتھیوں کے ساتھ ملکر ملک کو بچانے کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے۔ ان چار ساتھیوں میں دو پرانے بالشیوکی ہیں یعنی مولوٹوف اور وارشلاف اور دو نوجوان ممبر، بیریا اور مالنکوف۔

دس آدمیوں کی یہ جماعت "Politburo" کہلاتی ہے، یعنی تمام اشتراکی جماعتوں کی مرکزی کمیٹی کا پولٹکل بیورو۔ بالشیوکی نظام میں ایک سوپریم کونسل (پارلیمنٹ) ہے اور دوسری کیبنٹ جو تمام جماعتوں کے نمایندوں پر مشتمل ہے، لیکن اختیار کامل اسی پولٹکل بیورو کو ہے۔

اسٹالین جسے وہ خوزیان (Khozian) یعنی سردار کے نام سے پکارتے ہیں، اپنے ان نو مشیروں کو جمع کرکے رائے طلب کرتا ہے اور پھر جو فیصلہ ہوتا ہے اس پر عمل کیا جاتا ہے۔

۲- مولوٹوف - ۱۹۱۲ء سے اسٹالین کا دست و بازو ہے۔ اس کی عمر ۵۲ سال کی ہے یہ امور خارجہ کا وزیر ہے۔ جب اس کی عمر ۹ سال کی تھی تو زار کے حکم سے قید کردیا گیا تھا، لیکن بعد کو رہا ہوگیا۔ روس کے مشہور اخبار پراودا کا نامہ نگار بھی رہا ہے اور لینن کا معتمد بھی۔ اسٹالین نے اس کی دماغی اہلیت کا اندازہ کرکے زیادہ ذمہ دار کاموں پر لگایا، یہاں تک کہ اب وہ اسٹالین کا خاص آدمی سمجھا جاتا ہے۔ یہ روس کے تاتاری حصہ کا رہنے والا ہے۔

۳- اینڈریوچ (Andreyevich) - یہ کمیونسٹ پارٹی پر کنٹرول رکھنے والی کمیشن کا پریسیڈنٹ ہے۔ اس کی عمر ۴۷ سال کی ہے اور اسمولنسک کا باشندہ ہے۔ اول اول یہ کسی ہوٹل میں کام کرتا تھا اور پھر پیٹروگراڈ کے اسلحہ سازی کے کارخانہ میں۔ اس کی تعلیم کم ہے، لیکن فراست و تدبر میں کسی سے کم نہیں۔

۴- مالنکوف - اس کی عمر ۴۰ سال کی ہے اور اشتراکی سیاست کا ماہر ہے۔ اس نے ۱۹۲۰ء میں اشتراکیت کو اختیار کیا اور غیر معمولی قابلیت سے آہستہ آہستہ ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ آج وہ سنٹرل کمیٹی کے سکریٹریوں میں شامل ہے اور اسٹالین کے تمام دفتری کام کا ذمہ دار ہے۔

۵- اینڈری الگزنڈرووچ - اس کی عمر ۴۶ سال کی ہے۔ یہ لینن گراڈ کے حلقہ میں کمیونسٹ جماعت کا سردار ہے۔ ۱۹۱۳ء میں جب اس کی عمر ۱۰ سال کی تھی اس نے بالشیوکی مسلک قبول کیا۔ یہ فنلینڈ پر حملہ کرنے والی رائے کا بڑا موید تھا اس لئے اول اول یہ نگاہوں سے گر گیا تھا، لیکن چونکہ فنلینڈ کے بعض فوجی مقامات جن پر روسی قبضہ ہوگیا تھا، جرمنی کے خلاف جنگ کرنے میں مفید ثابت ہوئے اس لئے پھر وہی عزت اسے حاصل ہوگئی ہے۔ اس نے سیاست خارجہ پر بہت کچھ لکھا ہے اور اسٹالین اسے ایک ذہین نظریے بنانے والا کہتا ہے۔

۶- رنٹی پادلودچ بیریا - ۴۲ سال کی عمر ہے اور سوویٹ خفیہ پولیس کا افسر اعلیٰ ہے۔ ۱۹۳۶ء و ۱۹۳۸ء میں (Yezhov) جماعت کے افراد نکالنے میں (جو سوویٹ حکومت کے خلاف تھے) اس نے نمایاں خدمت انجام دی۔ اس نے انقلاب روس کی ایک تاریخ لکھی ہے جس میں اسٹالین کو انقلاب قاف کا ہیرو ثابت کیا ہے۔ اسٹالین کے مشیروں میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ یہی شخص ہے۔

۷- یوروشلاف - مجلس حفاظتِ ملک کی کمیٹی کا نائب صدر ہے اور فوج کی نمایندگی کرتا ہے، اس کی عمر ۶۰ سال کی ہے۔ یہ پہلے گلہ بانی کیا کرتا تھا، اس کے بعد معدنوں میں مزدور کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ یہ ۱۸ سال کی عمر میں قید ہوگیا تھا۔ سوویٹ فوج میں وہ بہترین پستول چلانے والا سمجھا جاتا ہے۔ یہ اسٹالین کا نہایت خاص آدمی ہے۔ اس وقت روس جو زبردست مدافعت کر رہا ہے اس کا امتیاز اسی شخص کو حاصل ہے۔

۸- لازار کاگنووچ - ۴۸ سال کی عمر ہے اور پولٹکل بیورو میں سب سے زیادہ قابل شخص سمجھا جاتا ہے۔ وادیِ ڈونٹز میں زراعت و صناعت کی ترقی

دینے کا سہرا اسی کے سر ہے، ریلوے اور پٹرول کے معاملات کا بڑا ماہر ہے۔ اسٹالین اس پر بہت اعتماد رکھتا ہے۔

۹- مکویان - ۶۴ سال کی عمر ہے۔ آرمینا کا باشندہ ہے۔ غذا اور تجارت کے مسئلہ کا ماہر خصوصی ہے۔ یہ بیرونی تجارت کا وزیر ہے۔ ۱۹۱۷ء سے اسٹالین کی جماعت میں شریک ہے۔ جب انقلاب روس کے بعد سول وار شروع ہوئی تو انگریزی فوج نے اسے گرفتار کر کے سفید روسیوں کے حوالہ کر دیا، لیکن اُس وقت یہ اتنی کم اہمیت رکھتا تھا کہ کسی نے پرواہ نہ کی۔ یہ اسٹالین کا نہایت رازدار دوست ہے۔

۱۰- کالی نن - پرانے بالشیوکوں میں سے اب یہی ایک رہ گیا ہے۔ اس کی عمر ۶۶ سال کی ہے۔ یہ سوویٹ کونسل کا پریسیڈنٹ ہے۔ یہ ایک کاشتکار خاندان کا فرد ہے اور زراعت پیشہ طبقہ کا نمائندہ۔ ۲۴ سال کی عمر میں یہ قید ہو گیا تھا۔ اپنی سیاسیات میں یہ نسبتاً قدامت پسند واقع ہوا ہے، لیکن ملوکیت کا سخت مخالف ہے۔

## جاوا پر قبضۂ جاپان کی اہمیت

مشرق میں ڈچ مقبوضات سے مراد وہ چند جزائر ہیں جو بحر پاسفک میں ہندوستان کے شرقی شمال گوشہ پر واقع ہیں۔ انھیں کو ایسٹ انڈیز کہتے ہیں، جن کا نام آجکل ہر اخبار میں نظر آتا ہے۔ انھیں جزیروں میں ایک جزیرہ جاوا بھی ہے، جس پر جاپان نے حال ہی میں قبضہ کیا ہے۔

جاوا اور اس سے ملے ہوئے جزیرہ مڈورا کا رقبہ صرف ۵۱۰۵۷ مربع میل ہے، لیکن آبادی ۴ کروڑ ۲۰ لاکھ ہے۔ گویا تمام ڈچ ایسٹ انڈیز کا ۲/۳ حصہ یا جاپان کا نصف۔ یہاں کی تاریخ بہت قدیم ہے اور جنوبی ایشیا میں جتنی تہذیبیں اسوقت تک قایم ہوئی ہیں ان سب کے نشانات یہاں ملتے ہیں، لیکن بود و مت کے لوگ بہت زیادہ ہیں۔ جاوا قدیم الایام سے بہت زرخیز اور آباد رہا ہے۔ رومہ سلطنت کے جغرافیہ دانوں نے بھی اس کا ذکر سونے اور چاول کی سرزمین کے نام سے کیا ہے اور قدیم چینی سیاحوں نے بھی (جب یورپ عہد تاریکی کی زندگی بسر کر رہا تھا) یہاں کی ترقیوں کا ذکر کیا ہے۔

یہاں کا خاص مقام بٹاویا ہے جو تمام ایسٹ انڈیز کا پایۂ تخت ہے۔ اس کو سترھویں صدی میں ڈچ کے ایک گورنر جنرل نے آباد کیا تھا اور اب رفتہ رفتہ ترقی کر کے ۵ لاکھ آبادی رکھنے والا، نہایت ہی متمدن شہر بن گیا ہے جس میں ایک یوروپین شہر کی سی بڑھتی ہوئی صنعتی ترقی ہر جگہ نظر آتی ہے۔

اُنیسویں صدی میں جب یہاں کی تجارت بڑھی تو بٹاویا کے پرانے بندرگاہ کو ناکافی سمجھا گیا اور ایک دوسری گودی ۱۸۸۶ء میں ۵ میل کے فاصلہ سے طیار کی گئی چنانچہ یہ گودی مشرق بعید کی نہایت آراستہ و وسیع بندرگاہوں میں شمار کی جاتی ہے۔ بٹاویا سے یہاں تک برقی ریلیں، موٹر بسیں اور نہروں کے ذریعہ سے موٹر کشتیاں ہر وقت آتی جاتی نظر آتی ہیں۔ بٹاویا، ڈچ ایسٹ انڈیز کا نہایت اہم تجارتی مرکز ہے اور یوروپ کی طرف سے آنے والوں کے دروازہ کا حکم رکھتا ہے۔

جاوا، شکر، چاول، مسالہ اور ربر کی پیداوار کے لئے خاص شہرت رکھتا ہے۔ ۸ کروڑ ایکڑ سے زیادہ یہاں چاول کی کاشت ہوتی ہے اور میدانی علاقوں کے علاوہ یہاں کا کوہستانی علاقہ بھی اپنی معدنی پیداوار کے لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے ..... چنانچہ، سونا، چاندی، ٹین، کوئلہ پٹرول بھی یہاں کافی مقدار میں پیدا ہوتا ہے۔ زراعتی اشیا میں علاوہ چاول کے تمباکو، چاء، کافی اور سنکونا بھی یہاں بہت پایا جاتا ہے اور عمارتی لکڑیوں کے جنگل بھی بہت ہیں۔ یہاں کا موسم بھی بہت معتدل اور درجہ حرارت ۷۰ اور ۹۰ ڈگری کے درمیان رہتا ہے۔

جس وقت جرمنی نے ہالینڈ پر قبضہ کیا تو ڈچ ایسٹ انڈیز پر جاپان نے دانت جمایا۔ کیونکہ اب ہالینڈ کی حکومت ہی ختم ہو گئی تھی اور وہ اِدھر کچھ نہ کر سکتی تھی چنانچہ پٹرول حاصل کرنے کی بہت سی رعایتیں جاپان نے حاصل کر لی تھیں، لیکن اب پاسفک کی لڑائی شروع ہونے کے بعد جاپان نے ان جزیروں پر بھی قبضہ کر لیا ہے اور سنگاپور کے بعد جاوا کا جاپان کے ہاتھ میں چلا جانا اس لڑائی کا اتنا اہم واقعہ ہے کہ اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ آپ نقشہ اُٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ جاوا کے قبضہ کے بعد آسٹریلیا اور ہندوستان سے تعلق، جاپان نے بالکل منقطع کر دیا ہے اور اب اگر کوئی مدد آسٹریلیا کو پہونچ سکتی ہے تو صرف امریکہ کی طرف سے اور وہ بھی اُن راستوں سے جو کم جانے بوجھے ہیں اور جن پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جاتا ——— چونکہ جاوا کی موجودہ آبادی زیادہ تر ملایا کی سی ہے، جو قومی و معاشرتی حیثیت سے جاپان کے قریب تر ہیں، اس لئے اندرون ملک میں جاپان کے خلاف کسی انقلاب کی امید نہیں کی جا سکتی۔

## قاف - سرزمین عجائب و غرائب

"قاف" کی روایات ہمارے یہاں ایک ایسی سرزمین سے متعلق تھیں، جہاں صرف پریاں رہتی ہیں اور انسان کی رسائی وہاں تک دشوار ہے۔ جب موجودہ جنگ میں جرمنی نے یوروپ کے جنوبی مشرقی حصہ پر حملہ کیا تو بہت سے عجیب و غریب نام جن سے ہم واقف نہ تھے سننے میں آئے اور اسی سلسلہ میں قاف کا نام بھی تھا، جس سے ہم بالکل "قطبین" کی طرح واقف تھے۔

اسوقت تک سیاح بہت سے نامعلوم سمندروں کو عبور کر چکے ہیں، اور بہت سے غیر معروف دریا، صحرا اور جزائر کا پتہ چلا کر وہاں کے حالات سے دُنیا کو باخبر کر چکے ہیں، لیکن "سرزمین قاف" ابتک "افواہ و روایات" کی دُنیا سے وابستہ ہے اور ہم زیادہ تر قیاس سے کام لیکر قاف کی ایک خیالی تصویر قایم کرنے پر قانع نظر آتے ہیں۔

آپ کسی سے پوچھئے کہ "قاف" کی حقیقت کیا ہے لیکن وہ کوئی جواب نہ دے سکے گا، آپ کسی سے دریافت کیجئے کہ وہاں کے باشندے کیسے ہیں، کس رنگ و مذہب کے ہیں، کیا زبان بولتے ہیں، اور ان کی معاشرت کیا ہے لیکن آپ کو اس کا کوئی صحیح جواب نہ مل سکے گا۔ اسی کے ساتھ آپ نقشہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ قاف کرۂ زمین کے مرکز پر واقع ہے اور تاریخ کا مطالعہ کیجئے تو ماننا پڑے گا کہ وہ کسی زمانہ میں قدیم تہذیب کا بھی مرکز رہا ہے۔

آپ ملکوں کی اُن حدود کو نہ دیکھئے جو انسان نے قایم کی ہیں، بلکہ جغرافیہ کے فطری حدود کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ دُنیا کے اتنے بڑے خشکی کے رقبہ کا ہے جو یوروپ و ایشیا دونوں سے تعلق رکھتا ہے اور جس طرح بحر "سرگاسو" سمندروں کا بحنور ہے، اسی طرح قاف بھی انسانی آبادی کا بحنور ہے جہاں مختلف قوموں کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے طبعی جغرافی کو آپ دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ شاید کسی وقت زمانۂ نامعلوم میں، پگھلی ہوئی زمین کے اندر سے ایک بڑی زبردست چٹان سیکڑوں میل لمبی چوڑی اُبھر آئی تھی اور اس کے دونوں طرف جو خلا پیدا ہو گیا تھا وہ پانی سے بھر گیا تھا اور انھیں دونوں خلاؤں کا نام بحر اسود اور بحر کاسپین ہے جن کے درمیان کوہ قاف کا سلسلہ ایک پُل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے سرزمین قاف نام ہے، اونچی اونچی کوہستانی چوٹیوں کے طویل سلسلہ کا، عجیب و غریب زرخیز وادیوں کا جو باوجود ایک حد تک گرم آب و ہوا کے منطقہ سے تعلق رکھنے کے جاڑوں میں منجمد برف سے ڈھک جاتی ہیں ـــ زمانۂ قدیم میں اس سرزمین پر یونان و روما، میڈیا و ایران، عرب و مصر، چین و تاتار، ترک و آرمینیا، سبھی کی فوجوں کا گزر ہوا ہے اور نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کتنے یہاں کی وادیوں میں بھٹک بھٹک کر اور کتنے خود اپنی مرضی سے یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ سرزمین قاف انسانی آبادی کے تنوع کے لحاظ سے ایک عجوبہ مرکز ہے اور یہاں دو سو مختلف قومیں آباد ہیں، جو تین سو مختلف زبانیں بولتی ہیں اور جن میں سے بعض کے درمیان دشوار گزار پہاڑوں اور ناقابل عبور وادیوں کے اتنے موانع حایل ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے بہ آسانی مل بھی نہیں سکتیں۔

ان میں بعض قومیں سفید رنگ کی ہیں، بعض سانولے رنگ کی، بعض بھورے اور بعض زرد رنگ کی جن کے عادات و خصایل بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں یہاں تک کہ ان میں بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو عہد بابل کی تہذیب سے ایک انچ آگے نہیں بڑھیں! ظاہر ہے کہ اس صورت میں ان کا مذہب بھی عجیب و غریب ہوگا چنانچہ یہاں عیسائی بھی ہیں لیکن انھوں نے کبھی عیسیٰ کا نام نہیں سُنا، یہاں مسلمان بھی ہیں جو رسول اللہ کے نام سے ناواقف ہیں، یہاں بودھ مذہب والے بھی ہیں جو مسیح کو بودھ سمجھتے ہیں۔ الغرض دنیا کے تمام مذاہب یہاں پائے جاتے ہیں لیکن بالکل مسخ شدہ صورت میں اور ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں کیونکہ ان میں سے اکثر کی زبان کوئی مکتوبی صورت نہیں رکھتی اور جو محض اس لئے ضبط تحریر میں نہیں آسکتی کہ وہ مجموعہ ہے صرف مبہم سی آوازوں کا جنھیں الفاظ میں منتقل کرنا ممکن ہی نہیں! لیکن باوجود ان تمام وحشتوں کے اس سرزمین میں ہر جگہ آزادی کی لہر دوڑی ہوئی ہے اور آجتک انھوں نے کسی کی غلامی قبول نہیں کی۔

انکے قانون میں سوائے دو باتوں کے اور کچھ نہیں۔ ایک یہ کہ اگر کسی قبیلہ کا آدمی مار ڈالا جائے تو اس کا بدلہ خون ہی سے لیا جاتا ہے اور دوسرے یہ کہ اگر عورت چرالی جائے تو اس کا جواب صرف خنجر سے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ وہاں کے غاروں میں، گلپوش وادیوں میں، پہاڑ کے سبزہ زاروں تاکستانوں اور سرو صنوبر کے جنگلوں میں خدا جانے کتنے خاندان اسی جذبۂ انتقام کی بدولت ابدی نیند سو رہے ہیں۔

یہاں کے لوگ ساری دنیا سے علٰحدہ اپنی زندگی ایک راز کی صورت میں بسر کر رہے ہیں، اور اجنبیوں کے لئے اُن سے خلا ملا بڑھانے کی کوئی راہ نہیں، ان کے یہاں نہ کوئی کتاب ہے نہ اخبار، اور خبریں سننے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک شخص ان کو بہ آواز بلند سرِ جادہ سنا دیتا ہے۔

سیاسی حیثیت سے یہ سرزمین مختلف جمہوریتوں میں منقسم ہے جو اتفاق کی مرکزی جمہوریت سے تعلق ہیں ـــ ان میں بعض جمہوریتیں کافی بڑی ہیں مثلاً آذربیجان جہاں باکو کے پٹرولی چشمے پائے جاتے ہیں اور جس کی آبادی ۴۰ لاکھ ہے۔ جمہوریت جارجیا کی آبادی ۳۰ لاکھ اور جمہوریت آرمینیا کی ۲۰ لاکھ ہے۔

جب انقلاب روس کے بعد بالشیوک لوگ یہاں پہونچے اور انھوں نے بالشیویت کے اصول بتائے تو سرزمین قاف کے لوگوں نے کہا کہ یہ تو کوئی نئی بات نہیں۔ ہمارے یہاں ہمیشہ سے یہی اُصول چلا آرہا ہے ـــ یہ سرزمین اپنی پیداوار کے لحاظ سے بہت دولتمند ہے۔ یہاں کی وادیوں میں کیلا، تاکو، انگور، اخروٹ، شفتالو، سونا، چاندی، کوئلہ، لوہا اور پٹرول سبھی کچھ پایا جاتا ہے اور ہٹلر انھیں چیزوں کے لئے یہاں پہونچنا چاہتا ہے۔

# نقوشِ اثر

(تشبیہِ مرکب، کنایہ، استعارہ اور لف ونشر کا دلکش امتزاج)

## خواب رنگیں:

(۱)

صبح نے جھانک لیا غرفۂ شب سے ہنسکر — کیا ہی شرمائی ہے آغوش میں گل کے شبنم
قہر اُس پر یہ نسیم سحری کا کہنا — "مستیاں خوب ہیں، اتنی نہیں لیکن، کم کم!"

(۲)

لاکھ دلکش ہے یہ منظر، مگر اے جانِ بہار — کاش پھر دیکھ لوں اکبار وہ دیکھا ہوا خواب
اثرِ عشق سے جب عارض گلگوں پہ ترے — ہلکا ہلکا سا پسینا تھا، اور آنکھوں میں خمار

## تصویرِ تصور:

جیسے کوئی فرشتہ کہ ہنگام سرخوشی — چھیڑے صبیح نغمہ سنہرے رباب پر
وہ زیر و بم کہ نرم تموج کہیں جسے — ہلکی پھوار نور کی جام شراب پر
بالکل یہی تصور جاناں کی شان ہے — جسوقت رات ہوتی ہے پورے شباب پر

## نظم "کاروانِ حیات" کا ایک جزو:

طلسم ساز ہے کوئی کلی کے پردے میں — چمن ہے ایک دلِ بے قرار، کیا کہئے
سکوت چھپائے پہر کا حیات سے لبریز — تمام محویت انتظار، کیا کہئے
ہوا میں ایک سبک زمزمہ طرب انگیز — کہ جیسے دور پہ ہو آبشار، کیا کہئے
ستارے چونک پڑے جب ذرا پلک جھپکی — فضا میں پھیل گیا انتشار، کیا کہئے
ہر ایک شے کو ہے منزل سے اپنی آگاہی — بجز بشر کہ ہے گم کردہ کار، کیا کہئے

مرزا جعفر علی خاں اثر

## چند منتخب اشعار : (فضل الدین اثر اکبرآبادی)

دیکھتا جاتا ہوں مُڑ مُڑ کر کسے — کیا کسی ہمدرد کی آواز ہے ؟
زندگی برسیگی دنیا پر اثر — آج میرے ہاتھ میں بھی ساز ہے

---

یہ فریب ہو کہ ہو مصلحت، ہمیں اس سے کیا سروکار ہے — وہ قرار بن کے جب آگئے تو سمجھ لیا کہ قرار ہے

---

اتنا تو ہوش ہے انھیں دیکھا تھا بے نقاب — پھر اس کے بعد کچھ نہیں معلوم کیا ہوا
شاید قریب تر ہیں رہائی کی ساعتیں — میرے قفس پہ سارا چمن ہے جُھکا ہوا

---

پھول نہیں، صبا نہیں، برق نہیں، گھٹا نہیں — آہ! اسیر فصلِ گل! کس سے تو ہمکلام ہے؟

---

اعتبارات محبت کی تسلّی کے لئے — اک فسانہ لکھ چلے ہیں تیرے سنگِ در پہ ہم
زندگی پھر اخذ کرتے ہیں سکوت مرگ سے — شمع روشن کر کے پروانوں کی خاکستر پہ ہم

---

یہ تو نہیں کہ عشق غم افزا نہیں رہا — غم تو رہا مگر غمِ دُنیا نہیں رہا

---

اب نہیں کچھ یاد کیا ہے شرطِ آدابِ وفا — نالہ کرنا چاہئے یا ضبط کرنا چاہئے

---

بغیر خواب وہ پھرنے لگے ہیں آنکھوں میں — مذاق دیدۂ بیدار دیکھتے جاؤ

---

مرے نکیب کو تھا انتظار صبح ابھی — چراغ وقت سے پہلے بجھا دیا تم نے

---

اثر پتھر کے ٹکڑوں میں وہ چھپ کر بول اُٹھتے ہیں — جبیں گھسنے پہ قدر سنگِ در معلوم ہوتی ہے

## غزل : پروفیسر شور

دل کی دھڑک سے بھی محبت اِک سکوں پاتی رہی — سینے کی ہر نازک خلش جینے میں کام آتی رہی
اِحساسِ غم بڑھتا رہا، اظہارِ غم ہوتا رہا — افسانہ ہم کہتے رہے محفل کو نیند آتی رہی
کانٹے بچھائے تھے جہاں پیغمبرانِ ہوش نے — اُن سجدہ گاہوں پر محبت پھول برساتی رہی
گم گشتگیِ شوق میں ایسا بھی اک عالم رہا — دیر و حرم کو ہر نظر آئینہ دکھلاتی رہی
اِک روح پرور یاد سے ہر زخم دل رستا رہا — اِک نرم و نازک چاندنی پھولوں کو جھلساتی رہی
طوفانِ رنگ و بو چمن زاروں سے اُٹھتا ہی رہا — دل کی کلی بارانِ شبنم سے بھی تھراتی رہی

اے شور ہر بھولا فسانہ مجھ کو یاد آتا رہا
اُس کی نظر ادراک دل اس طرح بکھراتی رہی

# چند منتخب اشعار: (حسرت ترمذی)

ساغر کا جس کو ہوش نہ ساقی کا ہوش ہے — ایسا بھی میکدے میں کوئی بادہ نوش ہے
کچھ منحصر بیاں پہ نہیں التجائے دل — ہر سانس، بازگشتِ صدائے خموش ہے

---

اپنی منزل کا پتہ اہلِ جنوں بھول گئے — اس قدر بھی کوئی وارفتۂ رفتار نہ ہو

---

کس لحظہ بے خبر میں رہا تیری یاد سے — کس لمحہ اپنے حال سے غافل نہیں رہا
حسرت وہ غم نصیب جیا بھی تو کیا جیا — جو اس کے التفات کے قابل نہیں رہا

---

درد کا درماں ہے، لیکن اس جنوں کا کیا علاج — کہہ رہا ہوں ان سے کچھ، اور مدعا کچھ اور ہے
کیوں جنوں عشق کا الزام دیتے ہو ہمیں، — سچ بتاؤ زندگی کا مدعا کچھ اور ہے
اس نے حسرت دو جہاں کے راز مجھ سے کہدئے — رازِ حسن و عشق جب پوچھا کہا کچھ اور ہے

---

## ماہر القادری کی تین غزلوں کا انتخاب

اُن کی نگاہِ مست سے مخمور ہو گئے — اتنے ہوئے قریب کہ ہم دور ہو گئے
ماہر وہ آئے قسمتِ منزل چمک اُٹھی — ذرے فروغِ نور سے معمور ہو گئے

---

اُٹھ کے خوابِ گراں سے آئے ہیں — کیا بتائیں، کہاں سے آئے ہیں
دیر و کعبہ پہ کیا نظر ڈالیں — ہم ترے آستاں سے آئے ہیں

---

آج تک یاد ہے وہ لذتِ آغاز مجھے — دیکھ! پھر دیکھ! نگاہِ غلط انداز مجھے
اس طرح دیکھ رہی ہے نگہِ ناز مجھے — جیسے آتے ہی نہیں ضبط کے انداز مجھے
آج تک ساز محبت کے ہیں پردے خاموش — دے گئی روزِ ازل آخری آواز مجھے